أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم

اسلام میں
امامت و امارت کا تصور

تالیف

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی
استاذ تفسیر و فقہ و مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

ناشر

دفتر امارت شرعیہ ہند بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی ۲

۷۸۶

نام کتاب ——— اسلام میں امامت وامارت کا تصور

مؤلف ——— مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی
استاذ تفسیر وفقہ ومدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

تعداد ——— ۲۰۰۰

سن اشاعت ——— ۱۴۰۷ھ م ۱۹۸۶ء

مطبوعہ ——— نیو پبلک پریس دہلی ۶

ناشر

دفتر امارت شرعیہ ہند ۱ بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی ۲

فہرست مضامین

تصدیق فقیہ امت حضرت مولانا محمود حسن مدظلہ
مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

مسئلہ امارت کو علمائے متکلمین نے بہت اہمیت دی ہے، ممالک کے حالات بھی بدلتے رہتے ہیں جن کی وجہ سے احکام میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے، اب سے انیس[۱۹] سال قبل بھی یہ سوال آیا تھا جس کا جواب احقر نے تحریر کیا تھا جس کی نقل رجسٹر میں موجود ہے[۱] اب یہ مسئلہ زیادہ عموم کے ساتھ اٹھا ہے زیر نظر رسالہ میں اسکے ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، حق تعالیٰ محترم مرتب رسالہ کو جزائے خیر دے اور مخلوق کو نفع پہنچائے اور ہر قسم کے فتنوں سے حفاظت فرمائے۔

العبد محمود غفرلہ
۲۳ر شعبان ۱۴۰۷ھ

---

[۱] حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کا یہ فتویٰ کتاب کے صفحہ ۶۳ پر موجود ہے دیکھ لیا جائے۔

تقریظ از حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری
استاذ حدیث دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم : نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

اہل بصیرت سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ "ملت" کی بقا و استحکام "حکومت و خلافت" سے ہے اور "دین" کی "شیرازہ بندی" اجتماعیت و قیادت سے ہے۔ مکی دور میں اگرچہ حکومت نہیں تھی مگر اجتماعیت و قیادت موجود تھی چنانچہ اسلام ترقی کے منازل طے کرتا رہا اور ایک وقت آیا کہ اس کو مرکزیت و حکومت بھی میسر آگئی اور اندلس میں حکومت کے خاتمہ کے ساتھ جب اجتماعیت و قیادت بھی ختم ہوگئی تو ملت کا نام و نشان اس سرزمین سے ختم ہوگیا۔

موجودہ ہندوستان میں اس امر میں قطعاً دو رائیں نہیں ہیں کہ مسلمانوں کو حکومت حاصل نہیں ہے اور نہ امارت کاملہ کے امکانات ہیں مگر ملت کی بقا و استحکام کیلئے اگر اجتماعیت و قیادت کی تشکیل کی جائے تو کوئی مانع نہیں ہے بلکہ یہ ایک دینی فریضہ ہے جسکی طرف مسلمانوں کو دیر سے سہی مگر توجہ مبذول کرنی تھی اور اس فرض کو پورا کرنا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اسکی داغ بیل پڑ گئی ہے۔ زیر نظر کتاب میں فاضل مرتب نے اسی نقطہ کی وضاحت کی ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس کتاب سے قارئین کو مسئلہ کے سمجھنے میں بہت مدد ملے گی اور علماء کرام اور دانشورانِ محترم کے تمام شکوک و شبہات دور ہو جائینگے، اور سب ہم خیال ہوکر "اللہ کی رسی" کو مضبوط پکڑنے کا عزم مصمم کریں گے۔

وما ذلک علی اللہ بعزیز

سعید احمد عفی عنہ پالنپوری ۲۳ر شعبان ۱۴۰۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کو انسان سے اصالۃً جو چیز مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس کی کبریائی کے آگے اپنا سر عجز خم کر دے اسی کو شریعت کی اصطلاح میں عبادت کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" پھر اس عبادت کی دو بڑی قسمیں ہیں، انفرادی و اجتماعی، انفرادی سے مراد ان چیزوں میں اللہ کی فرمانبرداری بجا لانا ہے جن کا تعلق انسان کی ذاتی زندگی سے ہے اس میں وہ تمام احکام آ جاتے ہیں جو عبادات واخلاق اور معاملات سے متعلق بیان کئے گئے ہیں، کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ اپنے کسی ذاتی معاملے میں اللہ کا حکم اسے معلوم ہو جائے اور وہ اس سے انحراف کرے،، ما کان لمومن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم،، اطاعت خداوندی کی دوسری قسم جسے اجتماعی سے تعبیر کیا گیا ہے اسکے احکام مطلقاً مطلوب نہیں ہیں بلکہ ان کا تعین ہمیشہ اس جماعت اور گروہ کے واقعی حالات کے تابع ہوتا ہے جو اس کا مخاطب ہے کیونکہ احکام کی تعمیل ایک عملی مطالبہ ہے اور کوئی مطالبہ مخاطب کی قوت واستطاعت کو دیکھ کر ہی کیا جاتا ہے، شریعت کا واضح اصول ہے "لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا" لہذا اجتماعی احکام حالات کی نسبت سے مشروع ہوں گے مثلاً اہل ایمان ایک خاندان کی صورت اختیار کر لیں تو اس وقت وہ اپنے دائرے کے مطابق اجتماعی احکام کے مکلف ہوں گے اور جس وقت اہل ایمان کی کوئی جماعت ایک بااختیار

وہ امامت کیا ہے ؟ کسی ایک لائق شخص کی سرداری میں افراد امت کی ایسی شیرازہ بندی کہ ان پر جماعت کا اطلاق ہو سکے، ہندوستان میں مسلمانوں کی پراگندگی اور انتشار کی جو کیفیت ہے اس پر کسی حسّاس مسلمان کی آنکھیں اشکبار نہیں لیکن کسی مریض کی حالت زار پر تیمار داروں کے آنسو خواہ وہ کتنے ہی مخلصانہ ہوں آب شفا کا کام نہیں دے سکتے۔

آج سے بیس برس پہلے امت کے طبیبوں نے ایک نسخہ لکھا لیکن اس نسخہ کے نفع و ضرر کے پہلو سے ہٹ کر اس نسخہ کے جواز و عدم جواز کی بحث شروع ہو گئی جو آج کے دن تک جاری ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مکّی زندگی میں بھی جو مادی بیکسی و بےبسی اور سیاسی عجز و ضعف کا عہد تھا ہمارے لئے امام کی حیثیت سے بھی ویسے ہی مطاع اور واجب الطاعہ تھے جیسے اپنی مدنی زندگی میں" (ملخص از مقدمہ مولانا سید سلیمان ندوی)

۱۳۵۹ھ کے بعد اب ۱۴۰۱ھ میں بھی موضوع امارت پر لکھنے والوں کا یہی حال ہے اور دو بحثوں کو بہت اہمیت حاصل ہے، ایک یہ کہ امام اور امیر کے لئے قوتِ نافذہ شرط ہے اور اس کے بغیر انتخاب درست نہیں ؟ دوسرے یہ کہ تمام مسلمانوں کا اتفاق و اتحاد ضروری ہے ہندوستان میں چونکہ انہی اختلاف کرنے والوں کی بدولت اتفاق نہیں اس لئے انتخاب امیر کا جواز نہیں ؟

جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مکّی زندگی کی تفصیلات میں سورۂ غاشیہ میں منصوص ہے۔

فذکر انما انت مذکر، لست علیہم بمصیطر۔	بس تو سمجھائے جا، تیرا کام سمجھانا ہے، تو ان پر داروغہ نہیں ہے۔

یعنی قوت نافذہ کے انتظار میں کام سے باز رہنا درست نہ ہو گا، جتنا ممکن ہے

فرائض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو، اللہ دینے والا ہے

ولسوف یعطیك ربك فترضیٰ — نیز اپروردگار تجھکو دے گا پھر تو راضی ہوجائے گا۔

چنانچہ پروردگار نے وعدہ پورا فرمایا اور مکی زندگی کی کمزور اجتماعیت، مدنی زندگی کی پروقار خلافت میں تبدیل ہوگئی، رہا یہ کہ مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کے بغیر اسکی گنجائش نہیں ہے تو حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی ازالۃ الخفاء، ابوالحسن ماوردی کی الاحکام السلطانیہ اور دوسری کتابوں میں تصریح ہے کہ ایسا اتحاد و اتفاق تو کبھی متحقق نہ ہوگا جسمیں کوئی رخنہ نہ ہو اس لئے ارباب حل وعقد کی ایک محدود تعداد سے یہ فریضہ ادا کیا جانا درست ہے۔

پھر اگر اختلاف کرنیوالوں کے اختلاف کو اہمیت بھی دیجائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہیکہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے، شریعت میں اس مسئلے میں عبادت کیطرح تفصیلی جزئیات نہیں دیے گئے ہیں، لیکن افسوس یہ ہیکہ اس موضوع پر دوسرے نقطۂ نظر کی وکالت کرنیوالے اجتہادی مسئلہ میں وہ زبان استعمال کر رہے ہیں جو اجماعی مسائل کیلئے خاص ہے، ان حضرات کو دیانتداری سے یہ لکھنا چاہیئے تھا کہ اس مسئلہ میں دو موقف ہیں اور دوسرے موقف کی بھی گنجائش ہے، پھر اس دوسرے موقف پر عمل کرنے والے کے ہاتھ مضبوط کرنا ضروری تھے کہ ارشاد ربانی ہے

ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ — یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

خدا جزائے خیر عطا فرمائے جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی کو، کہ موصوف نے اس موضوع کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا، اور راجح و مرجوح دونوں ہی نقطۂ نظر پیش کر کے، مسئلے کے تمام پہلو واضح کر دیئے، متعدد بالغ نظر علماء کرام نے اس کو پسندیدگی کی سند عطا کی خصوصاً مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی زید مجدہم نے اس مقالہ کو بالاستیعاب سنا ہے۔

خدا کرے موصوف کی بات ان لوگوں کی سمجھ میں آجائے جو پہلے خود ہی اختلاف کرتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ چونکہ اس معاملہ میں امت میں اتحاد نہیں ہے اس لئے ہندوستان میں "انتخاب امیر" کی گنجائش نہیں ہے۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ، والباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

ریاست علی بجنوری غفرلہٗ
۱۳/ شعبان ۱۴۰۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت

الحمد للہ الذی ارسل رسلہ بالبینات والہدی و
انزل معہم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط
واشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہٗ
واشہد ان محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ
وآلہ وصحبہ وسلم تسلیما کثیرا ! اما بعد

اسلام میں اجتماعیت و تنظیم لازمی طور پر مطلوب ہے، حتیٰ کہ عبادت میں بھی اس نے نظم قائم کیا، اور اجتماعیت کی شان پیدا کی ہے، نماز فرض کی تو جماعت کے ساتھ ایک امام کی اقتدار میں اس کے ارکان و افعال ادا کرنے کا حکم دیا، زکوٰۃ فرض کی تو اسکے جمع و صرف میں بیت المال کے ذریعہ نظم پیدا کیا، اور حج تو اجتماعیت کا ایک عظیم مظہر ہے کہ ایک وقت، ایک مکان، ایک ہیئت میں اس اہم ترین عبادت کی ادائیگی لازم کر دی گئی،

افتراق و تشتت چونکہ ائتلاف و اجتماعیت کی ضد ہے اس لئے اسلام اس کی مذمت کرتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو پراگندگی اور

حیات انفرادی سے سختی کے ساتھ روکتا ہے، اور حیات اجتماعی کا پورے اہتمام سے حکم دیتا ہے، اسلام کا مطمح نظر یہ ہے کہ اس کے ماننے والے جہاں کہیں بھی رہیں باہم متحد و منظم رہیں، ذیل کی آیات قرآنیہ سے اسلام کا یہ تصور پوری طرح واضح ہے۔

(۱) واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا۔	اور مضبوط پکڑو اللہ کی رسی کو سب ملکر اور پھوٹ نہ ڈالو۔

حبل اللہ سے مراد "قرآن کریم" ہے، جیسا کہ حضرت ابو سعیدؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں "کتاب اللہ وھو حبل اللہ الممدود من السماء الی الارض یعنی قرآن اللہ کی رسی ہے، جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ بن ارقم سے بھی یہی منقول ہے[۱]۔

یعنی مسلمانوں پر لازم ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے نظام حیات پر مل کر عامل ہو جائیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان سب متحد و منظم ہو جائینگے، جیسے کوئی جماعت ایک رسی پکڑے ہوئے ہو تو پوری جماعت جسم واحد بن جاتی ہے اور اس اجتماعیت سے اس میں حیات تازہ پیدا ہو جاتی ہے اور افتراق و انتشار کی صورت میں اجتماعی زندگی تباہ ہو جاتی ہے جس کے بعد انفرادی زندگی کی بھی خیر نہیں رہتی

محقق عماد الدین آیت بالا کے تحت لکھتے ہیں امرھم بالجماعۃ ونھاھم عن التفرقۃ وقد وردت الاحادیث المتعددۃ بالنھی عن

---

[۱] ابن کثیر ص ۳۸۸ ج ۱

التفرق والامر بالاجماع والائتلاف[1]۔

اجتماعی زندگی کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ ملت کی تنظیم کے لئے کوئی مستحکم رشتۂ وحدت ہو، اسیطرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس رشتۂ وحدت کو باقی رکھنے کی بھی سبیل پیدا کی جائے، چنانچہ رشتۂ وحدت اعتصام بحبل اللہ کی وضاحت کے بعد اگلی آیت یعنی ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر کے ذریعہ دعوت الی الخیر کا نظام قائم کرکے اس اجتماعیت کے بقا و استحکام کی صورت پیدا کی گئی ہے تاکہ حبل اللہ امت کے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے، اور ان کی اجتماعیت برقرار اور مستحکم رہے۔

سورۂ انفال کی درج ذیل آیت میں انتشار و اختلاف کے مضر نتائج کی نشاندہی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

(۲) ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم[2]	اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ کم ہمت ہوجاؤگے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائیگی،

یعنی باہمی نزاع واختلاف کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ذاتی طور پر کمزور اور بزدل ہوجاؤگے، اور اس کا دوسرا انجام یہ ہوگا کہ تمھاری ہوا خیزی ہو گی، مخالفوں کے دل و دماغ سے تمھارا وقار و دبدبہ نکل جائیگا، اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ کامیابی وکامرانی کی راہ میں باہمی انتشار و اختلاف ایک وسیع خلیج ہے جسے باہمی اجتماع و ائتلاف سے ہموار کئے بغیر منزل مقصود

---

[1] ابن کثیر ص ۳۸۹ ج ۱۔ [2] قرآن کریم پ ۱۰ ع ۲

تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے پاک ارشادات کے ذریعہ امت کو اجتماعیت کی دعوت دی ہے اور باہمی اختلاف و نزاع سے شدت کے ساتھ روکا ہے، ایک موقع پر آپسی جھگڑے اور اختلاف کی ہلاکت آفرینی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: "یہ حالقہ یعنی مونڈنے والا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ سر کو مونڈنے والا ہے بلکہ یہ تو دین کو مونڈ دیتا ہے اور اجتماعیت اور باہمی ائتلاف کی اہمیت کے بارے میں فرمایا المسلم اخو المسلم تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، اس موقع پر بنظر اختصار صرف دو حدیثیں نقل کی جارہی ہیں۔

(۱) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یرضی لکم ثلاثا ان تعبدوہ ولا تشرکوا بہ شیئا، وان تعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا، وان تناصحوا من ولاہ اللہ امرکم[۱]	اللہ تعالیٰ تم سے تین باتوں کو پسند کرتا ہے (۱) اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو (۲) سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو، اور منتشر نہ ہو جاؤ (۳)، خدا نے جس کو تمہارا والی بنایا ہو اس کی خیر خواہی کرو

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مسلمانوں کی اجتماعیت محبوب و پسندیدہ ہے اور ظاہر ہے کہ اجتماعیت کا قیام بغیر امیر کے نہیں ہو سکتا، اس لئے اخیر میں فرمایا کہ اللہ

---

[۱] رواہ مسلم فی صحیحہ۔

تعالیٰ نے جسے تم پر امیر بنایا ہو اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرو کیونکہ امیر و امور میں جب تک ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ نہیں ہوگا اجتماع و ائتلاف کا رشتہ مستحکم نہیں ہوگا۔

عن معاذؓ بن جبل قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الشیطان ذئب الانسان کذئب الغنم یاخذ الشاۃ القاصیۃ والناحیۃ وایاکم والشعاب وعلیکم بالجماعۃ والعامۃ [1]

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، شیطان انسان کا بھیڑیا ہے بکری کے بھیڑیے کی طرح جو ریوڑ سے الگ تھلگ رہنے والی نامانوس نیز چراگاہ میں دور تک نکلجانے والی بکری کو پکڑ لیتا ہے، اپنے کو انفرادیت (واضح رہے کہ یہ حاصل ترجمہ ہے لفظی نہیں ہے) سے بچاؤ اجتماعیت اور سب مسلمانوں کے ساتھ مل کر رہنے کو لازم سمجھو۔

اس ارشاد گرامی میں اجتماعیت کے التزام کی تاکید فرمائی گئی ہے، اور اور ساتھ ہی ایک بلیغ اور سہل ترین تشبیہ کے ذریعہ اس بات کو سمجھایا ہے کہ تشتت و افتراق کی زندگی ہلاکت و تباہی کا ذریعہ ہے جس سے بچنا امت کے لئے ضروری ہے۔

---

[1] رواہ الامام احمد فی مسندہ ج ۵ ص ۲۳۲۔

ان نصوص کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے اس کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ تشتت وافتراق اور حیات انفرادی کی زندگی پر قناعت کئے بیٹھے رہیں، اور تنظیم جماعت مسلمین کی حسب استطاعت کوشش نہ کریں۔

اجتماعیت کا تصور بغیر امیر کے ممکن نہیں

مذکورہ آیات واحادیث سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ امت مسلمہ اجتماعی زندگی کی مکلف ہے اور انتشار وحیات انفرادی پر قناعت اسکی قومی حیات کے لئے شرعی حیثیت سے بھی نقصان دہ وہلاکت خیز ہے اور دنیاوی لحاظ سے بھی، پھر اسلام میں اجتماعیت کا تصور بغیر امیر وامام کے نہیں پایا جاتا، چنانچہ نماز پنجگانہ میں جماعت مشروع کی گئی تو امام صلوٰۃ کے ساتھ اس جماعت کو منسلک کردیا گیا، جمعہ جو جامع الجماعات ہے اور اس میں دیگر فرض نمازوں کے مقابلہ میں بڑا اجتماع ہوتا ہے تو اس کے قیام کے لئے امیر یا قاضی کی موجودگی لازم کردی گئی، اسی طرح عیدین میں بھی بڑا اجتماع ہوتا ہے تو اس میں بھی یہ شرط ضروری ٹھہرائی گئی، اور جب فریضۂ حج کی ادائیگی میں اجتماعیت کی شان پیدا کی گئی تو اسے بھی امیر الحج سے مربوط کردیا گیا۔ اسی طرح مجاہدین کی جماعت کو امیر الجہاد سے وابستہ کیا گیا، غرضیکہ کوئی شرعی جماعت اور دینی اجتماع امیر وامام کے وجود سے خالی نظر نہیں آتا، اس لئے اسلام جب امت مسلمہ سے تنظیم جماعت اور اجتماعی زندگی گذارنے کا مطالبہ کرتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کو مکلف بناتا ہے کہ وہ اپنے لئے کسی امیر وامام کا انتخاب کریں اور اسی کی قیادت وسیادت میں اپنے ملی امور کو انجام دیں،

نصب امیر کے مخاطب ہر ملک کے مسلمان ہیں

پھر اسلام کا یہ مطالبہ کسی خاص زمانہ یا خاص خطۂ ارض یا کسی خاص حال کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک عام مطالبہ ہے جس کے مخاطب ومکلف ان ممالک کے مسلمان بھی ہیں جو خود مختار، با اقتدار اور قوت وشوکت کے مالک ہیں، اور ان دیار و امصار کے مسلمان بھی ہیں جو کسی غیر مسلم حکومت کے تحت زندگی گذار رہے ہیں، البتہ یہ تکلیف دونوں کے حسب استطاعت ہوگی، کیونکہ "لایکلف اللہ نفسا الا وسعہا" کے عمومی دستور کا تقاضا یہی ہے، اسی طرح دونوں جگہوں کے امیر و امام کی حیثیت میں بھی لازمی طور پر فرق ہوگا، جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آرہی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ اسی حقیقتِ ثابتہ کو اپنے انداز میں یوں بیان کرتے ہیں

یجب ان یعرف ان ولایۃ امر الناس من اعظم واجبات الدین بل لا قیام للدین ولا للدنیا الا بہا فان بنی آدم لا تتم مصلحتہم الا بالاجتماع لحاجۃ بعضہم لبعض ولا بد عند الاجتماع من رأس حتی قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا خرج ثلاثۃ فی سفر

یہ بات جاننی ضروری ہے کہ عام افراد انسانی کے امور کی ولایت دین کے اہم ترین واجبات سے ہے بلکہ بغیر ولایت کے دین و دنیا کسی کا بھی قیام ممکن نہیں کیونکہ نوعِ انسانی کے مصالح کی تکمیل اجتماعیت پر موقوف ہے اس لئے کہ انسان اپنی ضروریات کی تحصیل میں ایک دوسرے کا محتاج ہے، اور اجتماع کے وقت کسی رئیس کا ہونا ضروری ہے

فلیؤمروا احدھم۔ (رواہ ابوداؤد)

وروی الامام احمد عن عبداللہ ابن عمر قال لا یحل لثلاثۃ یکونون بفلاۃ من الارض الا امروا احدھم فاوجب صلی اللہ علیہ وسلم تامیر الواحد فی الاجتماع القلیل العارض فی السفر تنبیھا بذالک علی سائر انواع الاجتماعات۔[۱]

حتی کہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ "جب تین آدمی سفر کے لئے جائیں تو اپنے میں سے ایک کو امیر ضرور بنالیں" ایک دوسری حدیث میں فرمایا، ان تین آدمیوں کے لئے جو کسی صحرا و بیابان میں (بحالت سفر) ہوں ان کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنے میں سے ایک شخص کو امیر مقرر کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی اور سفر جیسے عارضی اجتماع میں امیر کے تقرر کو واجب فرما کر امت کو اس بات کی جانب متنبہ کیا ہے کہ ان کا کوئی بھی اجتماع امیر سے خالی نہیں ہونا چاہیئے۔

علامہ ابن تیمیہ کے اس استدلال کی تائید خلیفۂ ثانی حضرت فاروق اعظم کے اس قول سے بھی ہوتی ہے: "لا اسلام الا بجماعۃ ولا جماعۃ الا بامارۃ ولا امارۃ الا بطاعۃ"[۲] اجتماعی زندگی کی اسی اہمیت کے پیش نظر بار بار لوگوں سے کہتے رہتے تھے اذا کنتم ثلاثا فامروا۔[۳]

---

[۱] فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲۸ ص ۳۹۰ [۲] جامع بیان العلم وفضلہ ص ۶۲،
[۳] مصنف عبدالرزاق ج ۸ ص ۵۰ بحوالہ موسوعہ فقہ عمر بن الخطاب ص ۹۹

عصر حاضر کے مشہور عالم و مصنف مولانا ابوالحسن علی ندوی نظام امارت کی اہمیت و ضرورت کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

مسلمان خلافت و امارت کا نظام قائم کرنے کے شرعی طور پر مکلف ہیں اور اس میں کوتاہی و سہل انگاری ان کو گنہ گار بنا سکتی ہے، حدیث و فقہ کی کتابوں اور اسلام کی روح اور اس کے مقاصد کے صحیح فہم کا بھی یہی تقاضا ہے، اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کی کتاب "ازالۃ الخفا" اور مولانا اسمٰعیل شہید کی کتاب "منصب امامت" کا مطالعہ بہت مفید ہوگا پہلے کے مسلمان اس بات کے روادار نہیں تھے اور اس کو بہت بری بات سمجھتے تھے کہ ان کا کوئی مختصر وقفہ بغیر خلافت و امامت کے گزر جائے، چنانچہ مسلمان مؤرخین جب کسی نئے سال کے آغاز کا ذکر کرتے ہیں تو اس طرح لکھتے ہیں کہ نیا سال شروع ہوگیا اور مسلمان اب تک بلا خلیفہ کے ہیں۔

اگر وہ اس زمانہ میں ہوتے اور اس طویل مدت کو دیکھتے جو بغیر خلافت و امارت ہی کے نہیں بغیر کسی شعور و احساس اور فکر کے گذر رہی ہے تو ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرتے[1]

نظام امارت کے قیام پر جمہور امت کا اتفاق

نظام خلافت و امارت کا قیام یا بالفاظ دیگر نصب امیر کا مسئلہ ان چند مسائل میں سے ہے جن پر ملت اسلامیہ کے تمام قابلِ ذکر فرقے متفق و متحد نظر آتے ہیں (خوارج کی بعض جماعتیں اور اصم

---

[1] ارکان اربعہ ص ۱۹۱ حاشیہ۔

معتزلی وغیرہ معدودے چند افراد کا اختلاف جمہور امت کے اتفاق واجماع کے بعد کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اس لئے اس اختلاف کو کبھی درخور اعتنار نہیں سمجھا گیا) البتہ اگر اختلاف ہے تو اس کی تفصیلات میں ہے، جس کی تشریح وتفصیل کا نہ یہ موقع ہے اور نہ ہی اس مختصر تحریر میں اسکی گنجائش ہے، اس کی تفصیلات کے متلاشی علم کلام کی کتابوں کو دیکھیں۔

کتاب وسنت کے نصوص اور اسلامی عقائد کے صحیح فہم کا تقاضا یہی ہے کہ پوری ملّت متحد ومتفق ہوکر اس نظام کو بروئے کار لانے کی جدوجہد کرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے دن حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اسی تقاضائے شرعی نے مجبور کیا کہ وہ اپنے محبوب آقا کی تجہیز وتدفین کی اہم ترین وجذباتی ذمہ داری کی تکمیل سے پہلے نظامِ امارت کی تشکیل کی جانب متوجہ ہوں، اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عام طور پر امت نے اس مسئلہ کی اہمیت کو ہر عہد میں محسوس کیا ہے اور حسب توفیق واستطاعت اسے انجام دینے کی کوشش کی ہے، اگرچہ یہ سو فی صد صحیح ہے کہ خلفائے راشدین کے تیس سالہ دور کے بعد خلافت اپنے اعلیٰ اصولوں پر قائم نہ رہی اور بعد کے امراء خلافت علیٰ منہاج النبوت کے معیار کو برقرار رکھنے میں کامیاب نہ ہوسکے پھر بھی امت اس نظام سے وابستہ رہی اور اپنے اپنے عہد کے خلفاء وسلاطین کی زیر سرکردگی جمعہ وجماعت اور حج وجہاد وغیرہ اسلامی شعائر واعمال کو انجام دیتی رہی۔

امیر کے انتخاب کا طریقہ اب فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ

جب امت اپنے میں سے ایک شخص کو امیر بنانے کی مکلف ہے تو اس حکم شرعی کے انجام دینے کا کیا طریقہ ہو گا، کیا ملت کے ہر فرد کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایک جگہ جمع ہو کر اس کا انتخاب کریں یا ملت کا کوئی مخصوص طبقہ انتخاب کرے تو امت کے ہر فرد کی جانب سے یہ انتخاب متصور ہو گا، ظاہر ہے کہ پہلی صورت کا عمل میں آنا اگر محال نہیں تو متعذر ضرور ہے اس لئے کہ نہ تو سب کا اجتماع ممکن ہے اور نہ کسی ہونے والے امیر کے بس میں ہے کہ وہ ہر ایک کے پاس فرداً فرداً جا کر اپنی امارت کی بیعت لے، اس لئے لازمی طور پر یہ ماننا ہو گا کہ انتخاب امیر کی ذمہ داری کا تکفل پوری امت کی جانب سے امت کے ارباب حل و عقد کریں گے، چنانچہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

واذا تقرر ان هذا النصب واجب باجماع فهو من فروض الكفاية وراجع الى اختيار العقد والحل فتعين عليهم نصبه ويجب على الخلق جميعاً طاعته لقوله تعالى واطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم۔ [1]

جب یہ ثابت ہو چکا کہ نصب امیر باجماع امت واجب ہے پس یہ وجوب علی الکفایہ ہے اور ارباب حل و عقد اس وجوب کے مرجع ہیں اس لئے انھیں کے ذمہ امام کا نصب ہے (اور ان کے انتخاب کے بعد) پوری امت پر امیر کی اطاعت بحکم خداوندی "اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور اپنے میں سے امیر کی اطاعت کرو،، واجب ہو گی

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۶۱

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ انتخاب امیر کی صورتوں کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

انعقاد خلافت بچہار طریق واقع شود طریق اول بیعت حل و عقد است از علماء وقضاۃ وامراد وجوہ ناس کہ حضور ایشاں میسر شود واتفاق اہل حل و عقد جمیع بلاد اسلام شرط نیست زیرا کہ آں ممتنع است و بیعت یک دو کس فائدہ ندارد . . . . طریق دوم استخلاف خلیفہ ست مستجمع شروط را . . . . وطریق سوم شوریٰ است وآں است کہ خلیفہ شائع گرداند خلافت را درمیان جمعے از مستجمعین شروط و گوید کہ ازمیان ایں جماعت ہرکرا اختیار کنند خلیفہ او باشد . . . . طریق چہارم استیلا است چوں خلیفہ بمیرد شخصے متصدی خلافت گردد بغیر بیعت واستخلاف وہمہ را برخود جمع سازد بائتلاف قلب یا بقہر ونصب قتال خلیفہ شود[1] . . . . الخ

خلافت کا انعقاد چار طریقہ پر ہوتا ہے (۱) اہل حل و عقد کی بیعت یعنی وہ علماء و قضاۃ، امراء اور قوم کے سربرآوردہ جن کی حاضری میسر ہو جائے تمام بلادِ اسلام کے حل و عقد کا اتفاق شرط نہیں ہے کیونکہ سب کا اتفاق ممتنع ہے اور نہ ایک دو شخص کی بیعت مفید مقصد ہے (۲) پہلا خلیفہ اپنے بعد کیلئے کسی جامع شرائط کو نامزد کر دے (۳) مجلس شوریٰ کا قیام یعنی خلیفہ وقت ایک جماعت جامع شرائط میں خلافت کو دائر کر دے کہ یہ جماعت اپنے میں سے جس کو منتخب کر لے وہ خلیفہ ہوگا (۴) استیلا و غلبہ یعنی خلیفہ کی وفات کے بعد کوئی مدعی خلافت ہو جائے سب کو تالیف قلب یا جبر و قتل کے ذریعہ جمع کر لے تو وہ بھی خلیفہ ہو جائیگا۔

---

[1] ازالۃ الخفاء، ص ۵، حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ میں بھی یہی چاروں طریقے بیان کئے ہیں۔

شیخ ابوالحسن ماوردی نے اپنی مشہور کتاب الاحکام السلطانیہ کے صفحہ ۶، ۷ پر انعقاد امامت کی پہلی دو صورتوں یعنی بیعت حل و عقد اور استخلاف خلیفہ پر تفصیل سے بحث کی ہے جو اہل علم کے لئے لائق مراجعت ہے بہرحال قول محقق یہی ہے کہ انعقاد خلافت کے لئے جمیع اہل حل و عقد کا اتفاق ضروری نہیں بلکہ ایک معتد بہ جماعت کے بیعت کر لینے سے امامت و خلافت کا انعقاد ہو جاتا ہے، چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت پر اہلسنت والجماعت، روافض، معتزلہ وغیرہ سب متفق ہیں حالانکہ دیگر بلاد اسلامیہ کے علاوہ خود مدینہ کے بہت سے ارباب حل و عقد نے ان سے بیعت نہیں کی تھی، ابن خلدون لکھتے ہیں۔

اما واقعة علی رض فان الناس کانوا عند مقتل عثمان مفترقین فی الامصار فلم یشهدوا بیعة علی رض والذین شهدوا فمنهم من بایع ومنهم من توقف حتی یجتمع الناس و یتفقوا علی امام کسعد، وسعید، و ابن عمر، واسامة بن زید، و المغیرة بن شعبة، وعبد الله بن سلام، وقدامة بن مظعون

اور علی کرم اللہ وجہہ کا واقعہ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت لوگ دیگر شہروں میں منتشر تھے اس لئے بیعت علیؓ میں شریک نہ ہو سکے اور جو لوگ مدینہ میں موجود تھے ان میں بھی حضرت سعد، سعید، عبداللہ بن عمر، اسامہ بن زید، مغیرہ بن شعبہ عبداللہ بن سلام، قدامہ بن مظعون، ابوسعید خدری، کعب بن عجرہ، کعب بن مالک، نعمان بن بشیر، حسان بن ثابت، مسلمہ بن مخلد، وغیرہ اکابر صحابہ

وابی سعید الخدری، وکعب بن عجرۃ وکعب بن مالک، والنعمان بن بشیر وحسان بن ثابت، ومسلمۃ بن مخلد وفضالۃ بن عبید وامثالہم من اکابر الصحابۃ، والذین کانوا فی الامصار عدلوا عن بیعتہ ایضاً[1]

نے حضرت علی رض کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے اس وقت تک کے لئے توقف کیا تا آنکہ لوگ امام پر متفق ہوجائیں اور وہ حضرات جو شہروں میں منتشر تھے انھوں نے بھی بیعت سے اعراض کیا۔

۲۵ ذی الحجہ ۳۵ھ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر بیعت عام ہوئی ہے جس میں مذکورہ بالا اکابر صحابہ مدینہ میں موجود رہنے کے باوجود شریک نہیں ہوئے، بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کو بلاکر بیعت نہ کرنے کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے جواب دیا کہ ابھی فتنہ وفساد کا اثر ختم نہیں ہوا ہے اس لئے اس حالت میں ہم غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں[2]

اس کے باوجود تمام قدیم و جدید مؤرخین باتفاق خلافت مرتضوی کی ابتدا ۲۵ ذی الحجہ ۳۵ھ سے مانتے ہیں جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان ارباب حل و عقد کی عدم بیعت انعقاد خلافت کے لئے مانع نہیں ہوئی، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انعقاد خلافت کے لئے جمیع اصحاب حل و عقد کی بیعت ضروری نہیں ہے، حتیٰ کہ جس شہر میں امام کے ہاتھ پر بیعت امامت کی گئی ہے وہاں کے بھی تمام اہل حل و عقد کا اجتماع ضروری نہیں ہے، فتأمل ولاتکن مع الغافلین

---

[1] مقدمہ ص ۱۷۸۔ [2] تاریخ اسلام اکبر شاہ ص ۴۷۷ ج ۱۔

خلافت وامامت کی حقیقت

خلیفہ کے اوصاف وشرائط سے پہلے خلافت وامامت کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیئے تاکہ خلیفہ کے اوصاف کی تعیین بصیرت کے ساتھ کی جاسکے اس لئے کہ خلیفہ وامام کے اوصاف اور اس کے اندر پائی جانے والی شرطوں کا تمام تر مدار خلافت وامامت کی مسئولیت اور کارگزاریوں و ذمہ داریوں ہی پر ہے، اس حقیقت کے معلوم ہوجانے کے بعد لازمی طور پر یہ بات منقح ہوکر سامنے آجائے گی کہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھنے والا ہی خلیفہ وامام ہوسکتا ہے۔

امام ماوردی نے امامت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

الامامۃ موضوعۃ لخلافۃ النبوۃ فی حراسۃ الدین وسیاسۃ الدنیا [1]	امامت کی وضع نبوت کی نیابت کے لئے ہے دین کی حفاظت اور دنیاوی امور کے انتظام وتدبیر میں۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ امام وخلیفہ رسول کے نائب کی حیثیت سے دین کی حفاظت اور دنیاوی امور کے انتظام وتدبیر کی خدمت انجام دے گا اس لئے ان دونوں امور کی انجام دہی کے لئے جن اوصاف اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے امام میں ان سب کا پایا جانا ضروری ہوگا، اسی بات کو امام اسماعیل شہید دہلویؒ نے اپنے مخصوص پیرایۂ بیان سے یوں واضح کیا ہے۔

---

[1] الاحکام السلطانیہ ص ۵۔

باید دانست کہ امام نائب رسول است و امامت ظلِ رسالت؛ احکام نائب از احکام منیب تواں شناخت و حقیقت ظل را از حقیقت اصل تواں دریافت۔ [1]

معلوم ہونا چاہئے کہ امام رسول کا نائب اور امامت ظل رسالت ہے، نائب کے احکام منیب کے احکام سے معلوم کئے جا سکتے ہیں اور ظل و عکس کی حقیقت اصل کی حقیقت سے سمجھی جا سکتی ہے۔

نظام خلافت سے انحراف جائز نہیں

اس طرح کا نظام خلافت جس خطۂ ارض میں قائم ہوگا اسے اسلامی اصطلاح میں دارالاسلام، اور نظام حکومت کو اسلامی حکومت اور اس مملکت کے سربراہ کو خلیفہ، امام، امیرالمؤمنین اور بعد کی اصطلاح میں سلطان اور بادشاہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس قسم کا نظام قائم ہو جانے کے بعد کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ اس سے انحراف کرے اور امام و خلیفہ کی اطاعت سے اپنے آپ کو بالاتر سمجھے حکم خداوندی ہے

یآیھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ [2]

اے مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے امیر کی اطاعت کرو۔

اس فرمان ربانی میں تین اطاعتیں واجب قرار دی گئی ہیں، اللہ کی اطاعت، رسول کی اطاعت، اور امیر کی اطاعت۔ اللہ کی اطاعت کا

---

[1] منصب امامت ص ۳ ۔ [2] قرآن حکیم پ۵ ع ۴

حکم دیا گیا تو اس میں اللہ کے اسمائے صفت کے بجائے اسم علم کو ذکر کیا جس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بالذات واجب الاطاعت ہے کسی صفت کی وجہ سے اس کی اطاعت واجب نہیں ہوئی ہے، اور جب رسول کی اطاعت کا بیان فرمایا تو واطیعوا محمداً کے بجائے واطیعوا الرسول فرمایا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اپنی صفت رسالت کی بنا، پر واجب اطاعت ہیں، بذاتہ نہیں، اسی نکتہ کی جانب ذہن کو منتقل کرنے کے لئے دونوں اطاعتوں کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے، ایک دوسرے پر عطف نہیں کیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں کی حیثیت اطاعت جدا جدا ہے یعنی اول بالذات واجب اطاعت ہے اور ثانی بالصفت اور جب تیسری اطاعت کو ذکر کیا تو اطیعوا کے تکرار کے بجائے اولی الامر کی اطاعت کو رسول کی اطاعت کے بذریعۂ عطف تابع کر دیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ اولی الامر مستقلاً واجب الاطاعت نہیں ہے بلکہ رسول کے نائب ہونے کی حیثیت سے مطاع ہے اسی لئے نبی کریم ؐ کا ارشاد ہے من یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی[1] جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی، چونکہ امیر وخلیفہ رسول کا نائب ہوتا ہے اس لئے اس کا وہی حکم واجب الاطاعت ہوگا جو اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کے مطابق ہوگا، کسی معصیت کے حکم میں اس کی اطاعت جائز نہ ہوگی

---

[1] رواہ الشیخان

کیونکہ حکم معصیت میں وہ رسول کا نائب نہیں رہا، اس لئے اب وہ مطاع بھی نہیں رہا، اس حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں واضح فرمایا ہے۔

السمع والطاعة على المرء المسلم فيما احب وكره مالم يؤمر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة[1]	مرد مسلم پر سننا اور اطاعت کرنا ہے خوشی و ناخوشی ہر حال میں جب تک کہ کسی معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب گناہ کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ اطاعت کرنا۔

اس نظام سے خروج کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کی علامت قرار دیا ہے۔

عن ابی هريرةؓ قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم من خرج عن الطاعة وفارق الجماعة فمات ميتة جاهلية[2]	حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اطاعت سے خارج ہوا اور جماعت کو چھوڑ بیٹھا تو وہ جاہلیت جیسی موت مرا۔

ایک دوسری حدیث میں اس مفہوم کو یوں بیان فرمایا گیا ہے۔

من فارق الجماعة شبرا فكانما خلع ربقة الاسلام	جو ایک بالشت بھی جماعت سے علیحدہ ہوا تو گویا اس نے اسلام کا

---

[1] رواہ اصحاب الصحاح الستہ۔ [2] رواہ مسلم۔

عن عنقہ[1] حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔

اللہ اور رسول کے ان احکامات کے پیش نظر کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس نظام سے بغاوت کرکے امام کی اطاعت اور فرمانبرداری سے الگ ہو جائے۔ ایسی صورت میں امام کو حق پہنچتا ہے کہ ان زائغین اور منحرفین کو راہ راست پر لانے کے لئے زجر و تعزیر سے کام لے البتہ تعزیر میں قتل کرنا جائز نہ ہوگا، لیکن یہ منحرفین اگر اجتماعی شکل اختیار کرکے اپنی کوئی پناہ گاہ بنالیں تو اس صورت میں امام عادل ان سے جنگ کرکے ان کی قوت کو ختم کردے گا اور انھیں اطاعت پر مجبور کریگا[2]

خلیفہ کے شرائط لازمہ اور اسکے فرائض و اختیارات کی تفصیلات کی اس مختصر رسالہ میں گنجائش نہیں ہے اس لئے الاحکام السلطانیہ ص ۶، الحجۃ اللہ البالغہ وغیرہ کو دیکھا جائے۔

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ ایک مستقل نظام حکومت ...... ہے، اور ظاہر ہے کہ اس نظام کو اسی وقت قائم کیا جاسکتا ہے جب کہ مسلمان خود مختار، قوت و شوکت کے مالک اور کسی اور نظامِ حکومت کے محکوم و مغلوب نہ ہوں اسی وقت ان پر واجب ہوگا کہ اپنی جماعت میں سے کسی مستجمع شرائط کو اپنا امام و خلیفہ بناکر اسلامی مملکت کی داغ بیل ڈالیں اور اللہ کی زمین پر عدل و انصاف اور حق پرستی کا بول بالا کریں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی وہ کثیر جماعت جو کسی غیر دینی مملکت

---

[1] رواہ الترمذی۔ [2] الاحکام السلطانیہ ص

میں زندگی گذار رہی ہے اور اس کے اندر اسلامی نظام حکومت — قائم کرنے کی قوت و طاقت نہیں ہے، اس کے لئے اسلام کی کیا ہدایت ہے؟ کیا وہ اپنی اس محکومیت و مغلوبیت کی بنا پر اجتماعی زندگی گذارنے کی مکلف نہیں ہے، یا وہ غیر مذہبی اور لادینی اسٹیٹ میں رہتے ہوئے بھی تنظیم جماعت مسلمین کی مخاطب ہے، گذشتہ سطور میں قرآن و احادیث کے نصوص کے تحت یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ مسلمانوں کی ہر جماعت بغیر احوال و ظروف کی تخصیص کے اجتماعی زندگی گذارنے کی مخاطب ہے لیکن یہ خطاب ہر جماعت کو اس کی اپنی استطاعت کے مطابق ہوگا آئندہ سطور میں اس نظام اجتماعیت کی تفصیل ملاحظہ کیجئے۔

غیر اسلامی حکومت میں انتخاب امیر کا ثبوت فقہاء اسلام سے

مسلمان جن بلاد میں با اختیار ہیں اور کسی غیر اسلامی حکومت کے محکوم و مقہور نہیں ہیں، وہاں انھیں اپنے میں سے کسی ایک کو امیر و خلیفہ منتخب کر لینے اور اسلامی نظام حکومت کے تحت زندگی گذارنے کے سلسلے میں تو کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے احادیث، آثار صحابہ اور فقہاء امت کی تصریحات اس بارے میں اتنی زیادہ ہیں کہ انھیں جمع کیا جائے تو اچھی خاصی ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، علاوہ ازیں امت کا تعامل بھی اس پر شاہد عدل ہے، لیکن جن شہروں میں اسلامی حکومت نہیں ہے اور مسلمان غیروں کے زیر حکومت رہ رہے ہیں ایسے مقامات میں بھی اسلامی ضابطہ کے مطابق زندگی گذارنے کے لئے وہ نظام امارت کے مخاطب و مکلف ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں۔

خلافت یا امامت کبریٰ کے علاوہ مسلمانوں کو منظم و مربوط رکھنے کیلئے ان کے تعلقات کو آپس میں استوار و خوشگوار بنانے، اہل حقوق کو ان کے حقوق پہنچانے، ان کی عائلی زندگی کو شرعی احکام کے مطابق گذارنے انکے زکوٰۃ و صدقات کو صحیح مصارف میں صرف کرنے، ان کے تنازعات کا مستند قضاۃ اور شرعی عدالتوں کے ذریعہ فیصل کرانے، ان کو خلافت کبریٰ کے برکات میں سے حسب موقع و محل حصہ دلانے اور اس کی برکتوں کو دیکھ کر قیام خلافت کا متمنی اور اس کے لئے ساعی و کوشاں بنانے کے لئے شریعتِ اسلامی نے جزئی اور مقامی طور پر بھی امارت کے نظام قائم کرنے اور ایک امیر کے ماتحت سفر و حضر میں رہنے کی تاکید و وصیت فرمائی اور اس کو اتنی اہمیت دی کہ فرمایا " من استطاع منکم ان لا ینام نوما و لا یصبح صبحا علیہ امام فلیفعل " (ابن عساکر) اسی طرح ارشاد ہوا " اذا کان ثلاثۃ فی سفر فلیؤمروا احدھم۔ سنن ابی داؤد [1]

اس سلسلہ میں فقہاء کرام کی چند تصریحات ملاحظہ ہوں۔

(۱) و اذا لم یکن سلطان	جب سلطان نہ ہو اور نہ ہی ایسا شخص
ولا من یجوز التقلد منہ کما ھو	جس کی طرف سے قاضی مقرر کرنا صحیح
بعض بلاد المسلمین غلب	ہو جیسے مسلمانوں کے بعض وہ شہر جن پر
علیھم الکفار کقرطبۃ	کافروں کا غلبہ ہو گیا ہے، مثلاً مغرب

[1] مقدمہ امارت شرعیہ ص ۱۲ ۔

فی بلاد المغرب الآن وبلنسیة وبلاد الحبشة واقرّوا المسلمین عندھم علی مال یؤخذ منھم یجب علیھم ان یتفقوا علی واحد منھم یجعلونه والیا فیولّی قاضیا اوھو الذی یقضی بینھم وکذا ینصبوا لھم اماما یصلی بھم الجمعة [1]	میں اس وقت قرطبہ (کی یہی صورت ہے) اور بلنسیہ و بلاد حبشہ ہیں کہ کفار نے مسلمانوں سے کچھ رقم لے کر یہاں رہنے کی اجازت دے رکھی ہے (ایسی حالت میں) مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنی جماعت میں سے کسی ایک شخص پر متفق ہوکر اسے اپنا والی وامیر بنالیں وہ امیر قاضی مقرر کرے یا خود ہی مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرے گا اسیطرح ان کے لئے امام مقرر کریگا جو مسلمانوں کو نماز جمعہ پڑھائے گا۔
(۲) ولو فقد والٍ لغلبة کفار وجب علی المسلمین تعیین وال وامام للجمعة [2]	اگر غلبۂ کفار کی وجہ سے والی مسلم نہ ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ ایک مسلم والی اور امام جمعہ مقرر کریں۔

اسی طرح صاحب بحر لکھتے ہیں

(۳) واما فی بلاد علیھا ولاة الکفار فیجوز للمسلمین اقامة الجمعة والاعیاد	اور جن شہروں میں کفار حاکم ہیں وہاں جمعہ اور عیدین کا قائم کرنا صحیح ہے اور مسلمانوں کی باہمی رضا سے

---

[1] فتح القدیر ج ۲ ص ۳۶۵ - [2] فتح درمختار ص)

ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین ویجب علیہم طلب والٍ مسلم[1]

قاضی مقرر ہوجائے گا اور وہاں کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ ایک مسلمان والی (جامع صفات) طلب کریں۔

ان کے علاوہ شامی ج ۱ ص ۳۳۹ پر بھی معمولی سے الفاظ کے تغیر کے ساتھ یہی حکم موجود ہے۔

حضرات فقہاء کی تائید حضرت انسؓ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اختصار کے ساتھ کتاب الجنائز، کتاب الجہاد وغیرہ متعدد ابواب میں ذکر کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں۔

عن انس بن مالک قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اخذ الرایۃ زید فاصیب ثم اخذھا جعفر فاصیب ثم اخذھا عبد اللہ بن رواحۃ فاصیب وان عینی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لتذرفان ثم اخذھا خالد بن الولید من غیر امرۃ ففتح لہ۔[2]

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اسلامی) جھنڈے کو زیدؓ (بن حارثہ) نے لیا اور وہ شہید ہوگئے ان کے بعد اس علم کو جعفرؓ (ابن ابی طالب) نے لیا اور وہ (بھی) شہید ہوگئے پھر اسے عبد اللہؓ بن رواحہ نے لیا وہ بھی شہید ہوگئے (آپ اس واقعہ کو بیان کر رہے تھے) اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے، پھر علم کو خالدؓ بن ولید نے لیا (آنحضرتؐ کی جانب سے) امیر نامزد ہوئے بغیر (اور) انھیں فتح حاصل ہوئی۔

---

[1] البحر الرائق ج ۶ ص ۲۹۸ - [2] بخاری کتاب الجنائز ص ۱۶۷

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جمادی الاولیٰ ۸ھ میں ملک شام کے شہر موتہ کی جانب اسلامی لشکر بھیجا تھا اور امیر الجیش حضرت زید بن حارثہ کو مقرر فرمایا تھا اور ساتھ ہی یہ تصریح فرمادی تھی کہ اگر زید شہید ہوجائیں تو لشکر کے امیر جعفر بن ابی طالب ہوں گے اگر وہ بھی شہید ہوجائیں تو عبداللہ بن رواحہ امیر لشکر ہوں گے، تین ہزار مجاہدین اسلام پر مشتمل یہ لشکر موتہ پہنچا اور شامیوں سے جنگ ہوئی جس میں یہ تینوں حضرات علی الترتیب شہید ہوگئے تو اسلامی علم کو حضرت ثابتؓ بن اثرم نے اٹھالیا اور لشکر اسلامی سے فرمایا کہ متفق ہوکر اپنا ایک امیر منتخب کرلو، بہت سے مجاہدین نے کہا کہ آپ ہی اس منصب کو قبول فرمالیں لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے تو اسلامی فوج نے باتفاق حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو امیر الجیش منتخب کرلیا، اور انھوں نے بحیثیت امیر جنگ کی اور فتحیاب ہوئے۔ یہ تفصیل فتح الباری ج ۷ ص ۳۹۳، ۳۹۴ میں موجود ہے۔

امام عینیؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں۔ وفیہ جواز تولی امر القوم من غیر تولیۃ اذا خاف ضیاعہ وحصول الفساد بترکہ[1]۔ اس حدیث سے اس امر کا جواز ثابت ہے کہ (خلیفہ کے امیر بنائے بغیر) قوم کا امیر ہوسکتا ہے جب کہ قوم کے امر کے ضائع ہونے کا خوف ہو اور ترک امیر سے فساد کا اندیشہ ہو۔

اس حدیث کے الفاظ "غیر امرۃ" کے ظاہر سے بعض شراح حدیث کو دھوکہ لگ گیا اور انھوں نے اس سے یہ مسئلہ مستنبط کرلیا کہ قوم یا خلیفہ کی جانب سے مقرر ہوئے بغیر بھی امیر ہوسکتا ہے حالانکہ علی الاطلاق نہ یہ صحیح ہے اور نہ ہی

---

[1] عمدۃ القاری ج ۸ ص ۲۷

اس حدیث سے اس کا ثبوت ہوتا ہے اس لئے کہ اس موقع پر قوم کے اتفاق سے حضرت خالدؓ امیر ہوئے تھے، چنانچہ حافظ ابن حجر اس غلطی کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قال ابن المُنَیّر ان من تعین لولایۃ وتعذرت مراجعۃ الامام ان الولایۃ تثبت لذالک المعین شرعا وتجب طاعتہ حکما کذا قال۔ ولا یخفی ان محلہ ما اذا اتفق الحاضرون لہ[1]

ابن المنیر نے کہا ہے کہ حدیث مذکورہ باب سے یہ مسئلہ اخذ کیا جاتا ہے کہ جو شخص ولایت کے لئے (از خود) متعین ہو جائے اور امام کی طرف رجوع ہونے سے معذوری ہو تو اس صورت میں اس کی ولایت شرعًا ثابت ہو جائے گی، اور بحکم شرع اس کی اطاعت واجب ہو گی (ابن حجر اس استنباط پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں) یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ اس شخص معین کی امارت کا ثبوت اسی وقت ہو گا جب قوم بھی راضی ہو جائے۔

مطلب یہ ہے کہ امام المسلمین و خلیفہ وقت کی جانب سے جب کسی وجہ سے امیر کا تقرر دشوار ہو جائے تو بوقت ضرورت قوم کی مرضی سے امیر کا انتخاب ہو سکتا ہے اور انتخاب ہو جانے کے بعد اس امیر کی اطاعت شرعًا لازم ہو گی انتخاب امارت کا یہ واقعہ ارض حرب میں پیش آیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

لہ فتح الباری ج ۶ ص ۱۲۵

نے اسلامی فوج کے اس عمل پر اظہار رضا فرمایا اس لئے آنحضرت کی تقریر و تصویب سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بوقت ضرورت غیر اسلامی ملکوں میں مسلمان اپنا امیر منتخب کرسکتے ہیں اور اس امیر کی اطاعت اسی طرح سے واجب ہوگی جس طرح خلیفہ کی جانب سے مقرر کئے ہوئے امیر کی اطاعت لازم ہوتی ہے

(۴) ہندوستان کے مشہور عالم و محقق مولانا بحر العلوم فرنگی محلی لکھتے ہیں

ثم المشائخ قالوا لو کان للکافر والی بلدۃ فیجب علی مسلمی تلک البلدۃ ان یقیموا الجمعۃ ویسقط شرط الامام عنھم، الا انہ یجب طلب امام مسلم ینصبونہ۔ ؎

پھر مشائخ کہتے ہیں اگر کافر کی طرف سے کسی شہر کا والی مقرر ہو تو اس شہر کے مسلمانوں پر جمعہ قائم کرنا واجب ہوگا، اور ان سے امام کی شرط ساقط ہوجائے گی، لیکن مسلمانوں پر کسی مسلمان امیر کا طلب کرنا واجب ہے کہ اس کو امیر مقرر کریں۔

؎ رسائل الارکان ص ۱۱۴۔

ہندوستان میں قیام امارت سے متعلق علمائے ہند کی تصریحات

اکبر شاہ ثانی متوفی ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء کے عہد میں جب انگریزوں نے حکومت پر اپنا پورا تسلط قائم کر لیا اور بادشاہ کی حیثیت ایک نمائش سے زیادہ کچھ نہ رہی تو خاندان ولی اللٰہی کے گل سر سبد مسند ہند حضرت شاہ عبد العزیز نے یہ جرأت مندانہ اعلان فرمایا۔

کہ دریں شہر حکم امام المسلمین اصلا جاری نیست و حکم رؤسائے نصاریٰ بے دغدغہ جاری است، زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمایند و ہیچ مسلمان یا ذمی دریں شہر بغیر استیمان ایشاں دریں شہر و نواح آں نمی تواند آمد، و ازیں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ ممتد است[1]۔۔۔۔ الخ

اس شہر میں مسلمانوں کے امام کا حکم بالکل جاری نہیں ہے۔ بلکہ انگریزوں کا فرمان بے تکلف چل رہا ہے اس لئے کہ مساجد کو کسی تردد کے بغیر منہدم کر دیتے ہیں اور کوئی مسلم یا غیر مسلم انکی حفاظت طلب کئے بغیر اس شہر اور اس کے اطراف میں نہیں آسکتا اور اس شہر سے کلکتہ تک عیسائیوں (انگریزوں) کا عمل دخل پھیلا ہوا ہے۔

---

[1] فتویٰ عزیزی ج ۱ ص ۱۶

"لہٰذا یہ ملک اب دارالاسلام نہیں بلکہ دارالحرب ہے"۔ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کے بعد حضرات فقہاء کرام کی مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں درج ذیل فتویٰ صادر فرمایا۔

(۱) انتخاب امیر کا فتویٰ (از شاہ عبدالعزیز دہلویؒ)

اقامت جمعہ در دارالحرب اگر از طرف کفار والی مسلماناں در مکانے منصوب باشد باذن او درست است والا مسلماناں را باید کہ یک کس را کہ امین ومتدین باشد رئیس قرار دہند کہ باجازت وحضور او اقامت جمعہ واعیاد وانکاح من لا ولی لہ من الصغار وحفظ مال ایتام، وقسمت ترکات متنازع فیہا علی السہام می نمودہ باشد بے آنکہ در امور ملکی تصرف کند ومداخلت نماید۔ لہ

اگر دارالحرب کے کسی مقام میں کافر حاکم کی طرف سے مسلمان والی مقرر ہو تو اس کی اجازت سے جمعہ قائم کرنا صحیح ہے، ورنہ مسلمانوں کو چاہئے کہ ایک امانت دار ومتدین شخص کو اپنا امیر منتخب کریں اور اس کی اجازت یا موجودگی میں جمعہ وعیدین کا قیام، سرپرست سے محروم نابالغ بچوں کے نکاح کا انتظام، یتیموں کے مال کی حفاظت اور متنازع ترکوں کی سہام (حصہ شرعی) کے مطابق تقسیم کی جائے بغیر اس کے کہ ملکی امور میں مداخلت کی جائے

لہ فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۳۲۔

حضرت شاہ صاحب نے اپنے اس فتوے میں دارالحرب کے اندر انتخاب امیر کے حکم کے ساتھ امیر کی شرائط اور اس کے فرائض اور ذمہ داریوں کو بھی بیان فرمایا ہے کہ اس امیر کی شرائط میں " امانت و تدین ہے، اس کے لئے قوت و شوکت کا مالک ہونا شرط نہیں ہے، اور کسی حکومت کے زیر نگیں رہتے ہوئے یہ شرط متحقق ہو بھی نہیں سکتی، پھر اسکے فرائض میں جمعہ و عیدین کا قیام، بے سہارا مسلمان بچوں کے نکاح کا انتظام، یتیموں کے مال کی حفاظت، تقسیم وراثت کے سلسلے میں نزاع کا تصفیہ، انھیں پر دوسرے غیر مذکورہ امور کا قیاس کیا جا سکتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس امیر کے فرائض میں ملی و معاشرتی و انتظامی امور داخل ہیں، حدود و قصاص کا جاری کرنا یا قضاۃ کا تقرر وغیرہ وہ امور جن کا تعلق قوت و شوکت سے ہے اسکے فرائض میں داخل نہیں ہیں، کیونکہ ان امور کے انجام دہی کی اس کے اندر طاقت ہی نہیں ہے، اور نبی کریم ؐ کا ارشاد ہے اذا امرتکم بامر فاتوا منہ ما استطعتم[۱] جب میں تمھیں کسی بات کا حکم دوں تو اسے حسب استطاعت بجا لاؤ، لہٰذا اس امیر کو جن امور کی انجام دہی پر قدرت ہوگی وہی اس کے فرائض میں داخل ہوں گے۔

(۲) مولانا مفتی یوسف بن قادر کا فتویٰ (مع تصدیق حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی)

ثم لا یخفی ان کل بلدۃ وقریۃ فی بلادنا لم یخل	پھر یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ گذشتہ زمانہ میں ہمارے ملک کا کوئی شہر و

---

[۱] بخاری و مسلم۔

من والٍ و رئیس فی الزمان
المتقدم لکن فی هذا الزمان
وقع بین اهله التخالف و
الافتراق ولم یوجد القضاة
الا نادرا فینبغی ان یجتمعوا
ویتفقوا علی والٍ واحد حتی
یقیم به الجمع والاعیاد ویزوج
الایتام لان الوالی کالسلطان
فلا یجوز السلطان الا واحد
لانه جاء فی الحدیث اذا بویع
للخلیفتین فاقتلوا آخر منهما
فکذا الوالی فلیجتنب عن الوالی
الآخر - واللہ اعلم بالصواب
کتبه احقر العباد شیخ یوسف
بن قادر احمد عفی عنهما[1]

قصبہ امیر سے خالی نہیں تھا لیکن اسوقت
لوگوں میں اختلاف و افتراق پیدا ہو گیا
اور اب، قاضی شاذ و نادر ہی پائے
جاتے ہیں، لہٰذا ضروری اور مناسب
ہے کہ لوگ ایک والی پر مجتمع و متفق
ہو جائیں تاکہ اس کے ذریعہ سے جمعہ
عیدین کے قیام اور یتیموں کے نکاح
کا انتظام کیا جائے اس لئے کہ والی
مثل سلطان کے ہے اور (ایک ملک)
میں ایک ہی سلطان ہو سکتا ہے کیونکہ
حدیث میں آیا ہے " جب دو اماموں کی
بیعت کی جائے تو اس میں سے آخر کو
ختم کر دو، یہی حکم امیر کا ہے، لہٰذا ایک
کے ہوتے ہوئے دوسرے کو امیر بنانے
سے بچا جائے۔

صح الجواب واللہ اعلم حررہ الراجی عفو ربہ القوی ابو الحسنات
محمد عبد الحی تجاوز اللہ عن ذنبہ الجلی والخفی۔

اس فتویٰ کے جملہ " لان الوالی کالسلطان " کے بموجب امیر، والی جب

---

۱ [illegible]

سلطان کے حکم میں ہے توجس طرح سلطان کی اطاعت غیر معصیت میں واجب ہے، اسی طرح امیر بھی واجب الاطاعت ہوگا۔ اور نظام امارت کا تقاضا بھی یہی ہے، کیونکہ امیر کی اطاعت اگر شرعًا واجب نہ ہو بلکہ ہر شخص کو اس میں اختیار ہو کہ جی چاہے تو اطاعت کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے، اس پر عنداللہ کوئی مواخذہ نہیں تو اس نظام کے قائم کرنے سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوگا البتہ یہ فرق ضرور ہوگا کہ یہ نظام امارت چونکہ ارادی ہے قہری نہیں اس لئے اطاعت نہ کرنے والوں کو امیر اطاعت پر مجبور نہیں کرسکتا برخلاف سلطان کے کیونکہ وہ اطاعت سے منحرف کو بزور وطاقت اطاعت پر مجبور کرنے کا حق رکھتا ہے۔

اس فتوئی میں "والی" کے لفظ سے یہ دھوکہ نہیں ہونا چاہئے کہ "والی" امیر کے علاوہ کوئی اور منصب ہے، بلکہ یہ دونوں اصطلاح شرع کے الفاظ ہیں، اور لغت و شرع ہر ایک میں ایک ہی معنی کے لئے استعمال ہوتے ہیں

قال العلقمی الولایۃ ھی الامارۃ فکل من ولی الامر اوقام بہ فھومولاہ وولیہ[1]

(۴) نواب صدیق حسن خاں کا فتویٰ

عن عبداللہ بن عمران النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یحل لثلثۃ یکونون

عبداللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "تین ایسے شخص جو کسی بیابان وصحرا میں ہوں

[1] سراج المنیر ۱۷

بفلاة من الارض الا وامروا
عليهم احدهم رواه احمد
واخرج نحوه البزار باسناد
صحيح من حديث عمرؓ بن
الخطاب بلفظ، اذا كنتم ثلاثة
فی سفر فامروا احدکم ذاك
امیر امره رسول الله صلی الله
عليه وسلم واخرج البزار
باسناد صحيح من حديث
ابن عمرؓ مرفوعًا بلفظ، اذا كانوا
ثلثة فی سفر فليوٴمروا احدهم، و
اخرجه بهذا اللفظ الطبرانی
من حديث ابنؓ مسعود باسناد
صحيح وهذه الاحاديث
يشهد بعضها لبعض، وعن
ابیؓ سعيد ان رسول الله
صلی الله عليه وسلم قال
اذا خرج ثلثة فی سفر
فليوٴمروا عليهم احدهم
رواه ابو داود، والمنذری

حلال نہیں ہے مگر یہ کہ اپنے میں سے کسی
ایک کو امیر بنالیں" امام احمد نے اس حدیث
کی تخریج کی ہے، اور اسی طرح کی ایک
حدیث بزار نے سند صحیح کے ساتھ بروایت
عمر فاروقؓ بایں الفاظ تخریج کی ہے کہ
"جب تم تین آدمی سفر میں ہو تو اپنے میں
سے ایک کو امیر بنالو، یہ ایسا امیر ہوگا
جس کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
دیا ہے" پھر بزار ہی نے اسی حدیث کو
بسند صحیح عبداللہ ابن عمرؓ سے مرفوعًا
نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔
"جب تین آدمی سفر میں ہوں تو ان پر
لازم ہے کہ اپنے (ساتھیوں میں سے)
ایک کو امیر بنالیں" انھیں الفاظ کے
ساتھ طبرانی نے صحیح سند سے عبداللہؓ
ابن مسعود سے تخریج کی ہے اور یہ
سب احادیث ایک دوسرے کی شاہد
ہیں۔ اور ابو سعید خدریؓ نے روایت
کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ "جب تین آدمی سفر میں نکلیں

عن ابی سعیدؓ وابی ھریرۃؓ
وفیہا دلیل علی انہ
یشرع لکل عدد بلغ
ثلاثۃ فصاعدا ان یومروا
علیہم احدہم
لان فی ذلک السلامۃ
من الخلاف الذی یؤدی
الی التلاف فمع عدم
التامیر یستبد کل واحد
برایہ ویفعل مایطابق
ھواہ فیہلکون ومع
التامیر یقل الخلاف
وتجتمع الکلمۃ واذا شرع
ھذا للثلاثۃ یکونون
فی فلاۃ من الارض
اویسافرون فشرعیتہ
لعدد اکثر یسکنون القری
والامصار ویحتاجون
لدفع التظالم وفصل
التخاصم اولی واحری

تو اپنے میں سے ایک کو امیر ضرور بنالیں
اس حدیث کو ابوداؤد کے علاوہ منذری
نے بھی ابوسعیدؓ وابوہریرہؓ سے روایت
کیا ہے، ان احادیث میں اس بات
پر دلیل ہے کہ جو تعداد تین یا اس سے
زائد ہو ان کے لئے شرعی حکم یہ ہے
کہ ایک کو اپنا امیر بنالیں اس لئے کہ اس
میں ہلاکت رساں اختلاف سے امن ہے
کیونکہ امیر نہ ہونے کی صورت میں ہر شخص
اپنی رائے میں مستبد ہوگا اور جو خواہش
ہوگی اسے کرے گا جس کا انجام بربادی
ہوگی اور امیر ہونے کی صورت میں
اختلاف کم ہوجائیگا اور لوگوں میں
وحدت پیدا ہوجائیگی، اور جب امیر
بنانا ایسے تین شخصوں کے لیے جو کسی
بیابان وصحرا میں مقیم ہوں یا سفر میں
ہوں مشروع ہے تو ان کثیر التعداد
افراد کے لئے جو قصبات اور شہروں
میں آباد ہیں اور باہمی ظلم ونزاع کے
دفع کرنے کے محتاج ہیں اس کی مشروعیت

وفی ذالك دليل لقول من قال انه يجب على المسلمين نصب الائمة والولاة والحكام۔

بدرجۂ اولیٰ ہوگی اور اس حدیث میں اس شخص کے قول کی دلیل ہے جو کہتا ہے کہ امام، امیر اور حاکم کا تقرر کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔

ان احادیث سے بعینہ یہی استدلال امام ابن تیمیہ اور علامہ شوکانی نے بھی کیا ہے [1]

(۴) حضرت شیخ الہندؒ کی رائے

اس مسئلہ سے متعلق حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی کسی تحریر سے بندہ واقف نہیں ہے، البتہ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبۂ صدارت اجلاس لاہور ۱۸ تا ۲۰ نومبر ۱۹۲۱ء موافق ۱۷ تا ۱۹ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ کے درج ذیل پیراگراف سے حضرت شیخ الہندؒ کی رائے اس مسئلہ میں معلوم کی جاسکتی ہے مولانا آزاد رقمطراز ہیں

> حضرات! ۱۹۱۴ء کے لیل و نہار قریب الاختتام تھے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ حقیقت اس عاجز پر منکشف کی اور مجھے یقین ہوگیا کہ جبتک یہ عقدہ (یعنی نظام جماعت اور قیام امارت شرعیہ کا) حل نہ ہوگا، ہماری کوئی سعی و جستجو کامیاب نہ ہوگی، چنانچہ اسی وقت سے میں سرگرم سعی و تدبیر ہوگیا، حضرت مولانا محمود حسنؒ سے میری ملاقات بھی دراصل اسی سعی و طلب کا نتیجہ تھی، انہوں

---

[1] دیکھئے فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲۸ ص ۶۵ و ص ۳۹۰ و نیل الاوطار ج ۲ ص ۴۹۶۔

نے پہلی ہی صحبت میں کامل اتفاق کرلیا تھا اور یہ معاملہ بالکل صاف ہوگیا تھا کہ وہ اس منصب کو قبول کرلیں گے اور ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کردیا جائیگا، مگرافسوس کہ بعض زود رائے اشخاص کے مشورہ سے مولانا نے اچانک سفر حجاز کا ارادہ کردیا اور میری کوئی منت وسماجت بھی انھیں سفر حجاز سے باز نہ رکھ سکی۔

علاوہ ازیں جمعیۃ کے اجلاس دوم کے موقع پر جو ۱۹ر تا ۲۱ر نومبر ۱۹۲۰ء مطابق ۷ر تا ۹ رربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو حضرت شیخ الہندؒ ہی کے زیر صدارت دہلی میں ہوا تھا، حضرت شیخ الہندؒ کے ایما پر مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ یا بروایت دیگر مولانا محمد سجاد بہاریؒ نے انتخاب امیر کی تجویز پیش کی تھی جس کی تائید مولانا احمد سعید دہلویؒ نے کی، حضرت شیخ الہندؒ اسی اجلاس میں مولانا ابوالکلام سے بیعت کرنا چاہتے تھے، تاریخ امارت میں لکھا ہے۔

"آپ (حضرت شیخ الہندؒ) کا اصرار تھا کہ اس نمائندہ اجتماع میں جبکہ تمام اسلامی ہند کے ذمہ دار اور ارباب حل و عقد جمع ہیں ــــ "امیرالہند" کا انتخاب کرلیا جائے، پہلا شخص میں ہوں گا جو اس امیر کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔" ص ۵۲۔

لیکن یہ اہم ترین تجویز اور حضرت شیخ الہندؒ کی دیرینہ خواہش بعض علماء کے اختلاف کی وجہ سے پوری نہ ہوسکی جس کی تفصیل حکیم محمود احمد برکاتی نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح بیان کی ہے، جسے ماہنامہ میثاق لاہور شمارہ جنوری ۱۹۸۶ء میں دیکھا جاسکتا ہے۔

۱۹، ۲۰، ۲۱ر نومبر ۱۹۲۰ء کو جمعیۃ کے دوسرے سالانہ اجلاس میں شیخ الہند

کے حلقے کے علماء نے مولانا آزاد کو امام الہند منتخب کرلئے جانے کا منصوبہ بنالیا تھا، اجلاس میں بقول بعض مفتی کفایت اللہ نے اور بقول بعض مولانا ابوالمحاسن نے تجویز پیش کی، شیخ الہندؒ کی حمایت وتائید پہلے ہی معروف تھی آخر میں مولانا آزاد کھڑے ہوئے اور انھوں نے امارت شرعیہ کے قیام اور اس کے وجوب اور مصالح ومنافع پر ایک نہایت مدلل ومفصل اور مرصع وموثر تقریر کی جس سے حضرت شیخ الہند ہی کا حلقہ نہیں بلکہ حاضرین کی اکثریت ایسی مسحور ہوئی کہ مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کے لئے آمادہ ومستعد ہوگئے یہ لمحہ تھا جب مولانا معین الدین (اجمیری) نے خطاب کی اجازت مانگی جو بمشکل ملی اور انھوں نے معاصر علماء کو اپنے مختصر لیکن مؤثر خطاب میں اس طرف متوجہ کیا کہ۔

> قیام جماعت اور نصب امارت وامامت کے وجوب سے کسی کو انکار نہیں مگر کیا ضروری ہے کہ ہم امیر الہند کا انتخاب آج ہی کرگذریں اور مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت امامت کرلی جائے، یہ مسئلہ جتنا اہم ہے اتنے تدبر وصبر وسکون سے فیصلے کا متقاضی ہے عجلت اور جذباتی فضا میں فیصلہ کرڈالنا مناسب نہیں ہے، ہم سب کو غور وفکر اور تبادلۂ خیال کا موقع ملنا چاہئے تاکہ صحیح فیصلہ کیا جاسکے، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ چند دن کے لئے یہ فیصلہ ملتوی کردیا جائے (او کما قال)

برکاتی صاحب چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں" چنانچہ بیعت کا پروگرام ملتوی کردیا گیا"

حکیم برکاتی صاحب نے اس سلسلہ میں خود مولانا معین الدین اجمیریؒ

مرحوم کا ایک خط بھی نقل کیا ہے جسے مولانا اجمیری نے حکیم نصیر الدین ندوی کے نام لکھا تھا، اس خط میں مولانا لکھتے ہیں۔

"خالی الذہن علماء ان (مولانا آزاد) کی تقریر سے متأثر ہوئے اور اگر من جانب فقیر اس (انتخاب امیر) کے التوا کے متعلق مختصر مگر جامع تقریر نہ ہوتی تو کچھ عجب نہ تھا کہ حاضرین علماء اسی وقت اس مسئلے کو طے کر دیتے"

غور و فکر اور تبادلۂ خیال کے عنوان سے اس انتخاب کے ملتوی کرانے میں کیا جذبات کار فرما تھے اس کی تحقیق و تنقیح نہ ہماری اس تحریر کا موضوع ہے اور نہ ہی اس بھولی بسری تاریخ کو اب یاد دلانے میں کوئی فائدہ، یہ تھوڑی سی تفصیل محض اس لئے بیان کر دی گئی ہے کہ قاری کے ذہن میں اگر یہ سوال پیدا ہو کہ حضرت شیخ الہند جیسی عظیم المرتبت اور ہر دلعزیز شخصیت کی شدید خواہش کے باوجود اس موقع پر امیر کا انتخاب کیوں نہ ہو سکا تو وہ اپنے سوال کا جواب بھی پڑھ لے۔

اگر کوئی صاحب اس اختلاف کی پوری تاریخ پڑھنا چاہتے ہیں تو وہ مولانا سعید الرحمٰن علوی سابق مدیر خدام الدین لاہور کے مقالہ شائع شدہ میثاق اکتوبر ۱۹۸۳ء اور ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب سرافگندیم کا مطالعہ کریں نیز میثاق فروری ۱۹۸۵ء سے بھی کچھ تفصیل معلوم ہو سکتی ہے۔

(۵) حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کا فتویٰ

سوال: موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی غیر منظم حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ضرورت اس امر کی مقتضی ہے کہ امارت الاسلام کی کوئی صورت نکالی جائے، کیا آپ بیان فرمائیں گے کہ یہ مسئلہ شرعاً

کیا حکم رکھتا ہے؟ ۱ کیا ہم کو کل ہندوستان کے لئے یا کسی خاص علاقہ کے لئے اپنا امیر مقرر کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ ۲ اگر حق حاصل ہے تو کیا شرائط ہیں؟ ۳ اور آپ کی رائے عالی میں اس کے حصول کے لئے کیا ذرائع اور صورتیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں؟

حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس استفتار کا جواب درج ذیل تحریر فرمایا۔

الجواب ۱ حاصل ہے بشرط قدرت اور مشاہد ہے کہ حالت موجودہ میں امارت ارادیہ پر قدرت ہے امارت قہریہ پر قدرت نہیں ہے ۲ تدین اور عقل۔ ۳ یہ حکم شرعی کا سوال نہیں ہے جس کا جواب اہل علم سے لیا جائے، تدبیر کا سوال ہے جس کا جواب اہل تجربہ سے لینا چاہئے[1]

(۶) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کی رائے

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند جمعیۃ علماء کے اجلاس چہارم "گیا" منعقدہ ۲۴ تا ۲۶ دسمبر ۱۹۲۲ء کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبۂ صدارت میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ایسی حالت میں کہ مسلمان ایک غیر مسلم طاقت کے زیر حکومت ہیں اور ان کو اپنے معاملات میں مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے، ضروری ہے کہ مسلمان اپنے لئے والی اور امیر مقرر کریں .... چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں

میرے نزدیک مجلس منتظمہ کو فیصلہ کر لینا چاہئے کہ ترتیب مناسب کیا ہے، آیا اول امیر عام کا انتخاب کیا جائے اور بعدہ امراء صوبہ جات کا یا صوبجات کے امراء منتخب ہو جانے کے بعد امیر الہند کا انتخاب کیا جائے[2]"

---

[1] امداد الفتاویٰ ج ۴ ص ۹۰۵ بحوالہ النور شمارہ رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ ص ۲

[2] ماخوذ خطبۂ صدارت اجلاس گیا۔

(۷) محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا فیصلہ

لیکن جب تک کہ حکومت اس (یعنی مسلمانوں کے معاملات کیلئے دار القضاء قائم کرنے کے مطالبہ) کو منظور و نافذ کرے اس وقت تک کے لئے مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ خود اپنے اتفاق یا کثرت رائے سے امیر منتخب کریں ایسے امراء صوبہ وار ہونے چاہئیں اور پھر ان امراء کے اتفاق یا کثرت رائے سے تمام ہندوستان کے لئے ایک امیر اعظم ہو، اگرچہ حکومت برطانیہ کے قیام اور تسلط کی وجہ سے ان صوبہ وار امراء اور امیر اعظم کی کوئی سیاسی حیثیت نہ ہوگی مگر مذہبی ضروریات ان کے فیصلوں اور ان کے احکام سے صحیح طور پر واقع اور نافذ ہو سکیں گے اور مسلمانوں کا ایک بڑا مذہبی فرض (نصب امیر) ادا ہو جائیگا، اور ان کی تمام مصیبتوں کا حل نکل آئے گا جن میں وہ آج کل مبتلا ہیں[1]"

(۸) حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہما کی رائے

جمعیۃ علماء صوبہ بہار نے ۸؍۹؍ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ کو انتخاب امیر صوبہ بہار کے سلسلہ میں ایک خصوصی اجلاس حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمہ اللہ کی صدارت میں کیا تھا، اس موقع پر مولانا مرحوم نے ۴۴ صفحات پر مشتمل ایک طویل خطبہ پڑھا تھا، جس میں احادیث اور فقہاء اسلام کی تصریحات سے مسئلہ امارت کو اس قدر مدلل و مبرہن فرمایا ہے کہ اس میں اضافہ بہت مشکل

---

[1] ماخوذ خطبۂ صدارت اجلاس ہشتم پشاور دسمبر ۱۹۲۷ء

ہے مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کی کتاب ،، ہندوستان اور مسئلہ امارت ،، درحقیقت حضرت مولانا مونگیریؒ کے خطبہ کی شرح ہے ، غیر اسلامی ملک میں تنظیم امارت پر یہ خطبہ ایک وقیع علمی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس سے ہر زمانہ میں استفادہ کیا جائیگا ، مولانا کے خطبہ سے صفحہ ۴۱ کا ایک پیراگراف تبرکاً نقل کیا جارہا ہے

" حضرات ! ان تمام مباحث سے قطع نظر کرکے کہتا ہوں کہ شریعت کا ایک عام اصول ہے ،، الطاعۃ بقدر الاستطاعۃ ،، فقہاء اسلام نے بھی یہی لکھا ہے ، اور اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے ،، لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا ،، پس اسی اصول کے لحاظ سے آپ اسی کے مکلف ہیں کہ ایک شخص لائق کو منتخب کرکے قیام نظام شرعی کے لئے امیر اور والی بنائیں اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کریں تاکہ یہاں کی قوم مسلمان ایک باضابطہ جماعت اسلامی ہوجائے اور کافر بادشاہ کے ہوتے ہوئے جتنے احکام شرعی کا نظم و نفاذ کرسکتا ہے والی اس کا مکلف ہے اور اس پر اسی قدر لازم ہے جو اس کی استطاعت میں ہے ، علامہ ابن تیمیہ کا قول آپ سن چکے کہ انھوں نے قیام قضاء و امارت کی بحث میں یہ بتایا ہے کہ جس شخص نے بقدر استطاعت احکام انجام دیئے تو اس پر ان احکام کی ذمہ داری نہیں ہے جس سے وہ عاجز ہے "

(۹) مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ اور مسئلہ امارت

مولانا مرحوم قیام نظام امارت فی الہند کے زبردست داعی اور محرک تھے ، اس مسئلہ پر منجانب اللہ آپ کو شرح صدر حاصل تھا ، اس کے نظام کار اور اصول و دستور کی تدوین و ترتیب پر بھی کامل دسترس رکھتے تھے ، جمعیۃ علماء کے

اجلاس لاہور ۱۹۲۱ء کے موقع پر امیر شریعت کے اختیار و فرائض کے تعین کے لئے جو سب کمیٹی بنائی گئی تھی مولانا مرحوم اسکے رکن رکین تھے، اور "نظام نامہ امیر الشریعۃ فی الہند" کے عنوان سے مولانا مرحوم نے ایک مفصل دستور مرتب فرمایا تھا جو بعد میں جمعیۃ کی طرف سے شائع کیا گیا تھا جمعیۃ علمار کا اجلاس ششم (جنوری ۱۹۲۵ء) مولانا ابو المحاسنؒ ہی کی صدارت میں ہوا تھا موصوف نے خطبۂ صدارت میں مسئلہ امارت پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس مسئلہ کے لئے میرے دلمیں انشراح پیدا کرکے اس حقیقت کو ویسا ہی روشن فرمادیا ہے جس طرح سورج کی روشنی، اس لئے اس مسئلہ پر نوعیت و تشکیل کی حیثیت سے بہت زیادہ مفصل طور پر گفتگو کرنے کی خواہش تھی مگر کثرت مباحث اور ہر ایک کی طوالت نے تمنا پوری ہونے نہیں دی[1]۔

(۱۰) فقیہ ملت حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ کا فتویٰ

اوپر حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی رائے کے ضمن میں یہ بات گزر چکی ہے ۱۹۲۰ء و ۱۳۳۹ھ کے اجلاس جمعیۃ میں قیام امارت کی تجویز حضرت مفتی صاحب ہی نے پیش کی تھی، پھر اجلاس عام لاہور ۱۹۲۱ء ۱۳۴۰ھ کی تجویز کے مطابق امارت کے نظام کار اور اختیارات امیر کا ابتدائی خاکہ مرتب کرنے کے لئے جو سب کمیٹی مقرر کی گئی اس کے ایک رکن حضرت مفتی صاحبؒ بھی تھے، نیز بدایوں کے خصوصی اجلاس برائے تنظیم امارت (دسمبر ۱۹۲۱ء) میں امیر الہند کے شرائط، فرائض، تقرر و عزل وغیرہ

[1] خطبۂ صدارت اجلاس ششم مراد آباد جنوری ۱۹۲۵ء۔

کے سلسلہ میں جو ابتدائی بنیادی اصول پیش کیا تھا اس کا ایک حصہ مفتی صاحب
ہی نے بمشورہ شرکا، اجلاس مرتب کیا تھا، جس سے اس مسئلہ کے متعلق آپ
کی رائے روز روشن کی طرح سے ظاہر ہے اس لئے اس بارے میں مفتی صاحب
کی تحریر نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں پھر بھی ان لوگوں کے اطمینان کے لئے
جو فتویٰ ہی کی زبان سے مطمئن ہوتے ہیں حضرت مفتی اعظم کا ایک فتویٰ بھی
درج کیا جاتا ہے

حضرت مفتی صاحب سے کسی نے ہندوستان میں قاضی سے متعلق تین
باتوں کا شرعی حکم معلوم کیا تھا مفتی صاحب نے ان تینوں سوالوں کا مدلل جواب
تحریر فرمایا ہے، فتوی خاصا طویل ہے، یہاں اس کے اقتباسات پیش کئے جا رہے
ہیں جو صاحب پورا فتوی دیکھنا چاہتے ہیں وہ کفایت المفتی ج ۲ ص ۱۶۲ "دوسرا
باب عہدہ قضا اور قاضی کے فرائض" کی جانب رجوع کریں۔ حضرت مفتی صاحب
لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں پر پہلا اور مقدم فرض یہ ہے کہ وہ مسلمان والی مقرر کریں کیونکہ
بغیر والی مسلم کے بہت سی ضروریات پوری نہیں ہوتیں" ثم الاجماع علی
ان نصب الامام واجب والمذهب یجب علی الخلق "اس بات پر اجماع
ہے کہ امام مقرر کرنا فرض ہے اور مذہب اہل سنت کا یہ ہے کہ امام مقرر کرنا
مخلوق (مسلمانوں) پر واجب ہے (شرح عقائد ص ۱۱۰)

والمسلمون لابد لهم من	مسلمانوں کے لئے ایک ایسا امام ضروری
امام یقوم بتنفیذ احکامهم	ہے جو احکام جاری کر سکے اور حدود قائم

واقامة حدودهم وسد ثغورهم وتجهيز جيوشهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبة والمتلصصة وقطاع الطريق واقامة الجمع والاعياد وقطع المنازعات الواقعة بين العباد وقبول الشهادات القائمة على الحقوق وتزويج الصغار والصغائر الذين لا اولياء لهم وقسمة الغنائم ونحو ذلك من الامور التي لا يتولاها احاد الامة (العقائد النسفية ص ١١٠)

کرسکے اور سرحدوں کا انتظام اور جیوش مسلمین کی تیاری کر سکتا ہو، اور صدقات وصول کرے اور متغلب لوگوں کو دبا سکے چوروں اور ٹھگوں کو مقہور کر سکے، جمعہ وعیدین قائم کرے اور مقدمات کا فیصلہ کرے، شہادتیں قبول کرے، نابالغوں کا جن کے ولی نہیں ہیں نکاح کر دیا کرے غنائم تقسیم کرے اور اسی قسم کی بہت سی ضرورتیں ہیں جو افراد امت سے پوری نہیں ہو سکتیں۔ . . . .

ونصبه اهم الواجبات فلذا قدموه على دفن صاحب المعجزات (درمختار) قوله اهم الواجبات اى من اهمها لتوقف كثير من الواجبات الشرعية عليه ۔ (ردالمحتار ص۵۴۸ ج۱)

امام مقرر کرنا فرائض میں سے اہم فرض ہے اسی وجہ سے صاحب رسالت کے دفن سے پہلے صحابہ کرام نے امام مقرر کر لیا کیونکہ بہت سے واجبات شرعیہ امام پر موقوف ہیں۔

امام مطلق کے نصب کے تین دلائل ذکر کرنے کے بعد غیر مسلم علاقوں میں امیر کے تقرر کی دلیل میں درمختار کی یہ عبارت پیش کی ہے۔

ولو فقد وال لغلبة كفار وجب على المسلمين تعيين وال وامام للجمعة (درمختار)	اگر غلبہ کفار کی وجہ سے والی مسلم نہ ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ ایک والی مسلم اور امام جمعہ مقرر کریں[1]

(۱۱) مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نگاہ میں مسئلہ امارت :-

نظام امارت کے قیام کی ضرورت واہمیت اور تنظیم جماعت کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

امامت کیا ہے؟ کسی لائق شخص کی سرداری میں افراد امت کی ایسی شیرازہ بندی، کہ ان پر جماعت کا اطلاق ہو سکے، احکام شرعی کا نفاذ واجراء بقدر امکان انتظام پا سکے، اور جمعہ وجماعت اور نکاح وطلاق ومیراث وغیرہ کے احکام کی تنفیذ ہو سکے، اور اگر اس سے زیادہ قوت ہو تو استخلاف وتمکین فی الارض کا وہ فرض بھی ادا ہو سکے جس کی بشارت قرآن پاک نے دی ہے

ہندوستان میں مسلمانوں کی پراگندگی اور انتشار کی جو کیفیت ہے اس پر کس حساس مسلمان کی آنکھ اشک بار نہیں لیکن کسی مریض کی حالت زار پر تیمار داروں کے آنسو خواہ وہ کتنے ہی مخلصانہ ہوں آب شفا کا کام نہیں دے سکتے اس کے لئے تو دوا کی تلاش میں دوڑ دھوپ طبیبوں کی کھوج کی سعی وکوشش اور مریض کو دوا پلانے کے لئے جدوجہد تاکید دوا برام ہی کام آسکتا ہے[2]

---

[1] کفایت المفتی ج ۲ ص ۲۱۶ و ۲۱۷، [2] دیباچہ ہندوستان اور مسئلہ امارت ص ۱، ۲۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں،

ہندوستان کے ہر طبقہ کے مسلمانوں کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہئے کہ کہ آئندہ ہندوستان کی جو شکل وصورت بھی ہو، بہر حال یہاں کی حکومت اسلامی نہ ہوگی، بہتر سے بہتر جو صورت خیال میں آسکتی ہے وہ متحدہ جمہوریت کی ہے۔ اسلئے ہر حال میں مسلمانوں کے لئے ضروری ہو گا کہ اپنے قومی و مذہبی ضروریات کے اپنے آپ کفیل ہوں اور یہی ضرورت بعینہ اس وقت بھی ہے، مسلمانوں کی اسلامی، مذہبی تعلیم، ان کے مدرسے ان کی مسجدیں ان کے اوقاف، ان کے نکاح وطلاق وو راثت وغیرہ قوانین ومسائل خاص موں کے محتاج ہیں، اور آئندہ بھی رہیں گے، اس وقت ہم جس بے نظامی اور بے ترتیبی کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ حد درجہ قابل افسوس ہے . . . . . چند سطروں کے بعد

. . . .

ہندوستان میں اب اور اب سے زیادہ آئندہ مسلمانوں کو اپنی بقا کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک امارت شرعی کے ماتحت اپنے کو منظم کریں . . . . چند سال پہلے جب اس کے لئے موسم مناسب تھا، محض اس لئے بعض اکابر نے اس سے پہلو تہی کی کہ تمام مسلمان اس پر متفق نہیں ہوسکتے اس لئے جب تک اتفاق عام نہ ہو جائے اس کو قائم نہ کیا جائے ۔۔ میری رائے میں حد درجہ غلطی ہے ۔۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی طاقت کے بغیر مسلمان از خود ایک مرکز پر متفق ہو جائیں، اس لئے اس خیال خام سے ہٹ کر ہم کو صرف یہ کرنا چاہئے کہ صوبوں میں اسکے متعلق کوششیں کریں . . . . اور جس قدر مسلمان اس مسئلہ پر متفق ہوسکیں اور اس تحریک پر آمادہ ہوسکیں ان کو ساتھ لے کر

آگے بڑھنا چاہیے، آئندہ اس سلسلہ کی خود وسعت ہوتی رہے گی ——
اسلام کے عقیدہ میں نظم جماعت کے بغیر ہم صحیح اسلامی زندگی پر یقیناً قائم نہیں ہیں " نصب الامام واجب "[۱]

(۱۲) حضرت شیخ الاسلامؒ مولانا مدنیؒ کی رائے

"تذکرہ جمعیۃ علماء ہند" نامی رسالہ جو شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلویؒ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ اور مولانا احمد سعید دہلویؒ کے دستخطوں سے مولانا عبدالحلیم صدیقی ناظم جمعیۃ علماء ہند نے دفتر جمعیۃ علماء ہند دہلی سے شائع کیا تھا اس میں امارت شرعیہ کے متعلق حسب ذیل عبارت ہے۔

"اس موقع پر ہم اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں قیام امارت اور نظام شرعی کی ضرورت اور اہمیت اس وقت محسوس ہونے لگی تھی جب کہ اسلامی حکومت کا چراغ گل ہو رہا تھا حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے وقت میں قیام امارت کے وجوب کا فتویٰ دیا تھا چنانچہ اس فتوے پر سب سے پہلے اسوقت عمل کیا گیا جب کہ حضرت سید احمد بریلویؒ کو امام اور امیر منتخب کیا گیا، پھر ۱۸۵۷ء میں حضرت حاجی امداد اللہؒ کو امام و امیر منتخب کیا گیا، لیکن اس انقلاب عظیم کے بعد حالات ناساز گار ہوگئے زبان و قلم پر جبروتی مہریں لگا دی گئیں، مگر ہمارے اکابر کے دل و دماغ اس تخیل سے کبھی غافل نہیں رہے اور مقصد عظیم کے

---

[۱] از خطبۂ صدارت اجلاس ہفتم کلکتہ ۱۹۲۶ء۔

مبادیات میں مشغول رہ کر اس وقت کا انتظار کرتے رہے جب کہ
حالات سازگار ہوں اور اسلامی نظام جماعتی شرعی اصول و
ضوابط سے قائم کرنا ممکن ہوجائے، اب جبکہ یہ حالت پیدا ہوچکی
ہے تو ضرورت ہے کہ مرکزی نظام شرعی اور " قیام امارت فی الہند"
کی تجویز شرعی کو عملی شکل دی جائے[1]

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے بحیثیت صدر جمعیۃ علماء ہند ۱۳۶۸ھ میں صوبہ بہار کی جمعیۃ علماء کو ایک سرکلر کے ذریعہ یہ ہدایت فرمائی تھی،

" خصوصیت کے ساتھ صوبہ بہار کی جمعیتوں کو ہدایت کی جاتی ہے
کہ وہ زکوۃ کی رقوبات کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ مسلمانوں
کو سمجھائیں کہ وہ زکوۃ و صدقات کی رقوم حسب معمول امارت شرعیہ
کے بیت المال میں جمع کریں[2]

ان تحریروں کے علاوہ جمعیۃ علماء کے بارہویں اجلاس عام جون ۱۹۴۰ء کے موقع پر حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی صدارت میں امارت شرعیہ کے قیام کے سلسلہ میں ایک طویل تجویز منظور ہوئی تھی (یہ پوری تجویز بندہ کے رسالہ " ہندوستان میں امارت شرعیہ کا نظام اور جمعیۃ علماء کی جدو جہد" کے صفحہ ۳۴ و ۳۵ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے) حضرت مدنیؒ نے اس موضوع پر دہلی میں ایک مبسوط تقریر بھی فرمائی تھی جس کے سننے والے آج بھی موجود ہیں۔

---

[1] تذکرہ جمعیۃ علمائے ہند، ص ۳۳ و ۳۴۔
[2] سرکلر جمعیۃ علماء ہند ۱۳۶۸ھ۔

(۱۳) مولانا عبدالحق مدنی سابق مہتمم مدرسہ شاہی مراد آباد کا مشورہ

جمعیۃ علماء ہند کا گیارہواں اجلاس عام مارچ ۱۹۳۹ء میں دہلی میں ہوا جس کی صدارت ملک کے نامور ادیب و محقق عالم حضرت مولانا عبدالحق مدنی دیوبندیؒ نے فرمائی تھی، موصوف اپنے خطبۂ صدارت میں لکھتے ہیں

"آپ حسب ضرورت "امارت شرعیہ" بھی قائم کریں تاکہ اسلامی پرسنل لا کے تحفظ کا جذبہ ہر ایک مسلمان کے دل میں پیدا ہوسکے نیز قیام امیر کا فریضہ بھی امکانی حد تک ادا ہوجائے جس کے متعلق علامہ سید انور شاہ کشمیری صدر اجلاس جمعیۃ علماء ہند منعقدہ پشاور ۱۳۴۶ھ نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا، مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ خود اپنے اتفاق یا کثرت رائے سے امیر منتخب کریں، ایسے امراء صوبے وار ہونے چاہئیں اور پھر ان امراء کے اتفاق یا کثرت رائے سے تمام ہندوستان کیلئے ایک امیر اعظم ہو۔"[۱]

(۱۴) مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں نظام امارت

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے "الہلال" "البلاغ" اور رسالہ "مسئلہ خلافت" کو جن حضرات نے بھی پڑھا ہوگا وہ پوری طرح جانتے ہیں کہ مولانا آزاد مرحوم اس مسئلہ کے بارے میں کس قدر حساس تھے وہ مسلمانوں کی ان تمام پریشانیوں کا واحد علاج نظام امارت اور تنظیم امارت اور تنظیم جماعت کو قرار دیتے ہیں اس جگہ مولانا کے ایک خطبہ

---

[۱] ماخوذ از خطبۂ صدارت اجلاس یازدہم جمعیۃ علماء ہند دہلی ۱۳۵۸ھ۔

کا اقتباس پیش کر رہے ہیں جس سے پورا اندازہ ہو جائے گا کہ وہ اس مسئلہ کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مولانا رقم طراز ہیں۔

حضرات! آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مختصراً اس مسئلہ کی نسبت میں بھی کچھ عرض کروں، جس کو میں علی وجہ البصیرۃ آج تمام اعمال اصلاحیہ کے لئے بمنزلۂ اصل و اساس کے یقین کرتا ہوں اور کامل بارہ سال کے متصل غور و فکر کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ بغیر اسکے کبھی عقدۂ کا حل نہیں ہو سکتا، میرا اشارہ مسئلہ نظام جماعت اور قیام امارت شرعیہ کی جانب ہے۔

مسئلہ نظام جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاحِ حال اور ادائے فرائض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہو سکتی جب تک اپنے موجودہ حیات انفرادی کو ترک کر کے حیات اجتماعی و شرعی اختیار نہ کریں، یعنی احکام نظام شرع کے مطابق سب ایک امیر و قائدِ شرع کی اطاعت پر مجتمع نہ ہو جائیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا ہو جائے۔ یہی اصل و اساس کا رہے اور تمام مقاصدِ اصلاح اور مصالح انقلاب کا نفاذ و ظہور اسی کے قیام و وجود پر موقوف ہے۔[1]

(۱۵) حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی رائے

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ

---

[1] ماخوذ خطبۂ صدارت اجلاس سوم جمعیۃ علماء ہند لاہور ۱۹۲۱ء

سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اس مسئلہ میں جمہور علماء ہند کے ساتھ ہیں، افسوس کہ اس مسئلہ سے متعلق حضرت قاری صاحب کی قلمی تحقیق تک بندہ کی رسائی نہیں ہوسکی البتہ ان کی ایک مطبوعہ تقریر اس وقت میرے پیش نظر ہے اس تقریر کو حضرت قاری صاحب کی حیات ہی میں کتب خانہ محمودیہ دیوبند نے "امارت شرعیہ کا قیام" کے نام سے صاحبزادۂ محترم مولانا محمد سالم صاحب کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا تھا، تقریر کے جامع مولانا نثار احمد قاسمی سہارنپوری ہیں۔ پوری تقریر اکیاون عنوانات اور اٹھاون صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، امارت شرعیہ کی ضرورت واہمیت اور افادیت پر مشتمل یہ تقریر بہت سے علمی نکات اور نادر واقعات کو شامل ہے، اس مختصر رسالہ میں نہ تو پوری تقریر نقل کی جاسکتی ہے اور نہ ہی اس کا خلاصہ، اس لئے بنظر اختصار صرف دو اقتباس پیش کئے جارہے ہیں۔

"امارت کا حق کس کو ہے" اس عنوان کے تحت حضرت قاری صاحب کی یہ رائے درج ہے۔

"اگر خلیفۃ المسلمین اور بادشاہ اسلام موجود ہے تو اصل امیر وہ ہے جن کو وہ امیر مقرر کریں، وہ امیر بن جائیں گے، اگر اسلام کی حکومت نہیں ہے تو فقہاء لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ سب مل کر اپنا ایک امیر مقرر کرلیں اگر سارے ملک کے مسلمان ایک امیر پر جمع نہ ہوں تو خطوں کے امیر بنالئے جائیں ہر صوبہ کا الگ امیر ہو اور تمام مامورین آپنے اپنے امام کی اطاعت کرنا واجب ہے، اسی کو قرآن کریم نے فرمایا ہے یاایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" (امارت شرعیہ کا قیام ص ۲۵و۲۶)

ایک دوسرے عنوان "امارت شرعیہ کا قیام تنظیم ملت کا ذریعہ ہے" کے تحت فرماتے ہیں۔

"امارت شرعیہ کا قیام ضروری ہے اور فقہا لکھتے ہیں کہ جب حکومت اسلامی نہ ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنا ایک امیر مقرر کریں اپنے معاملات میں ان کی طرف رجوع کریں اور سمع وطاعت کے ساتھ اس پر چلیں اس کا فائدہ پوری قوم کو پہنچے گا، وہ یہ کہ جب پوری قوم منظم ہوگی اور ایک کے تابع ہوگی تو اغیار پر اثر پڑے گا کہ یہ ہے متحد و منظم قوم"[1]

آزادیٔ وطن کی تقریب کے موقع پر ۱۵؍۱۶؍ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب میں طلبہ دارالعلوم اور اہل شہر کے مجمع میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"آج کی آزادی میں جہاں ان (مسلمانوں) کے لئے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ انگریز کا دوسو سالہ اقتدار ختم ہوگیا جس کے لئے وہ بے چین تھے، وہیں اس فکر کا موقع بھی ہے کہ ان کی حیات اجتماعی کی اس ملک میں اب کیا صورت ہوگی؟ اس کے لئے انھیں ابھی سے قدم اٹھانا چاہئے، شریعت مقدسہ کی روشنی میں صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم کرنے کے لئے اپنے میں سے کسی امام اور متدین امیر کا انتخاب کریں، ہندوستان کی مسلم جماعتیں منتشر رہنے کے بجائے متحد ہوں، ایک ہو جائیں اور اسلام کے کلمے پر ایک ہوں، ایک امیر کے ماتحت شرعی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں اسی

---

[1] امارت شرعیہ کا قیام ص ۵۴، ۵۵

ایک جملے میں ان کی حیات اجتماعی کی لمبی چوڑی تفسیر پنہاں ہے[1]۔

(۱۶) فقیہ امت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی صدر شعبۂ دار الافتاء دار العلوم دیوبند کا فتویٰ[1]

سوال :- (الف) موجودہ حالات میں اگر کسی صوبہ کے مسلمان اپنا کوئی امیر منتخب کریں تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی، جب کہ اس کے پاس کوئی قوت نافذہ اجرا احکام و فرامین کے لئے موجود نہیں ہے، کیا ایسا امیر ہر مسلمان کے لئے شرعی حیثیت سے واجب الاطاعۃ ہے؟ اور کیا ہر ایک مسلمان کو شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی رو سے ایسے امیر کے احکام وفرامین کی اطاعت وفرماں برداری کرنی ضروری ہے۔

(ب) جن صوبوں کے مسلمانوں نے کسی امیر کے ماتحت زندگی نہیں گزاری ہے اور بغیر نصب امیر کے اس ملک میں مر گئے، کیا وہ سب "مات میتۃ جاھلیۃ" کے تحت آتے ہیں؟

(ج) کیا موجودہ حالات میں کسی صوبہ کے منتخب شدہ امیر کی شرعاً وہی حیثیت ہوگی جو کہ امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین کی نافرمانی کرنے والوں کیلئے ہے؟۔

الجواب :- حامداً ومصلیاً، اعلیٰ بات تو یہ ہے کہ اہل اسلام کے معاملات کا نظم ونسق ایک مرکز سے وابستہ ہو، اور اس پر سب متفق رہیں اور اپنے معاملات کچہریوں میں لے جانے کے بجائے شریعت کی روشنی میں حل کرایا کریں

---

[1] تاریخ دار العلوم دیوبند ج ۱ ص ۱۳۹

اس مرکز کی شاخیں جگہ جگہ قائم ہوں، اور سب کو مرکز ہدایت دے، نگرانی کرے اور اس مرکز کو پورا اقتدار پوری قوت حاصل ہو، اگر اس طرح اجتماعی ایک مرکز نہ بن سکے تو ہر صوبہ میں جداگانہ مرکز بنالیا جائے اور صوبہ کے مختلف مقامات میں حسب ضرورت اس کی شاخیں قائم کردی جائیں، ایک صوبہ کو دوسرے صوبے خیرخواہانہ اور ہمدردانہ تعلق ہو، حریفانہ اور رقیبانہ نہ ہو، جس مرکز پر سب متفق ہوکر عہد کرلیں اس کی پابندی حدود شرع کے ماتحت لازم ہوگی، عہد شکنی کی اجازت نہ ہوگی، اس کے فیصلوں کو تسلیم کرنا ہوگا، اگر کوئی فیصلہ خلاف شرع ہوگیا ہو اور اس میں چوک ہوگئی ہو تو اس پر نظر ثانی (اپیل) کی بھی اجازت ہوگی، ایسے مرکز کی موجودگی میں کوئی جداگانہ کمیٹی بناکر اس سے فیصلہ کرانا غیر مستحسن و مذموم ہوگا کہ اس سے انتشار و خلفشار پیدا ہوتا ہے جس سے توقع ہوتی ہے کہ اللہ پاک اس کو اصل امارت کا ذریعہ بنادے اس بنا پر اس سے پورا تعاون کرنا لازم ہوگا۔

لیکن موجودہ حالات میں قوت منفذہ اور قوت قاہرہ موجود نہ ہونے کی بنا پر فی الحال اس کو خلافت اسلامیہ کی حیثیت حاصل نہ ہوگی اور اسکے امیر کو امیرالمومنین کا مقام حاصل نہ ہوگا، لہذا اگر کوئی شخص اس صوبہ کا باشندہ اپنا مقدمہ وہاں فیصل نہ کرائے کسی اور سے فیصل کرائے تو اس کو نہ باغی کہا جائیگا نہ خارجی، نیز اگر وہ فیصلہ حدود شرع کے موافق ہو تو اس کو غلط بھی نہ کہا جائیگا، باضابطہ خلافت اسلامیہ رہتے ہوئے بھی کسی حکم سے فیصلہ کرانا جرم نہیں ہے، البتہ تقابل کی صورت اختیار نہ کی جائے۔

جہاں کے مسلمان ایسے مرکز نہ بناسکیں (یا) نہ بنائیں ان پر "مات میتۃ جاھلیۃ" کی وعید چسپاں کرنے سے قبل خود اس مقولہ کی تحقیق ضروری ہے،

باوجود تتبع کے کتب حدیث میں من حیث المتن یہ مقولہ نہ مل سکا کہ اس کی سند دیکھ کر رفع، قطع، وصل، ارسال کی تحقیق کی جاتی، نیز رواۃ کی جرح وتعدیل کی بحث دیکھنے کا موقع ملتا۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند

۳۰/ ۷/ ۸۵ھ

فتاوی محمودیہ ج ۵ ص از ۳۰۳ تا ۳۲۲

بنظر اختصار صرف سولہ اکابر علماء کے فتاوی اور آراء پیش کئے گئے ہیں ورنہ ایسے حضرات علمائے کرام ومفتیان عظام کی ایک طویل فہرست پیش کی جاسکتی ہے جو موجودہ حالات میں امارت شرعیہ کے نظام کو وقت کا ایک اہم تقاضا سمجھتے ہیں اور ان میں خاصی تعداد ایسے بزرگوں کی ہے جنھوں نے عملاً اس نظام کے قائم کرنے کے سلسلے میں تگ ودو اور جدوجہد فرمائی ہے۔

نظام امارت ہند کی مختصر تاریخ

احیاء دین، اعلاء کلمۃ اللہ اور خدا کی زمین پر خدا ہی کے احکام و فرمان کے نفاذ و اجراء کے لئے نظام امارت و تنظیم جماعت کی ضرورت و اہمیت کو ہمارے اسلاف نے کبھی بھی فراموش نہیں کیا، بلکہ حالات نے جب بھی اجازت دی حسب استطاعت اس اہم ترین ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی مخلصانہ جد و جہد کی ہے اور احوال و ظروف کے مطابق بتوفیق ایزدی مکی و مدنی دونوں عہد کی سنتوں کو زندہ کر دکھایا ہے۔ آئندہ صفحات میں اکابر رحمہم اللہ کی اسی انقلابی جد و جہد کی مختصر تاریخ پیش کی جا رہی ہے۔ انشاء اللہ اس کے مطالعہ سے شبہات کے پردے ہٹیں گے، خدشات کے زخم مندمل ہوں گے، مسافرانِ منزل کو حوصلہ ملے گا، اور اس راہ کی صعوبتوں کے تصور نے جن کی ہمتیں پست کر دی ہیں ان میں بھی قدم سے قدم ملا کر چلنے کی ہمت پیدا ہوگی۔

(۱) امارت شرعیہ کی تاسیس

قیام امارت کی ضرورت علمائے اسلام نے اسی وقت محسوس کر لی تھی جب کہ ہندوستان کی مسلم حکومت کا چراغ مفلس کے دیئے کی طرح ٹمٹمانے لگا تھا

چنانچہ وقت کے جماعت علماء کے سربراہ اور خاندان ولی اللٰہی کے چشم و چراغ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا فتویٰ قیام امارت اسی احساس کا جرأتمندانہ اظہار تھا، اور اس فتویٰ کو غیر منقسم ہندوستان میں پہلی بار جس جماعت نے عملی جامہ پہنانے کا بیڑا اٹھایا وہ بھی حضرت شاہ صاحبؒ ہی کی ساختہ پرداختہ تھی۔ یعنی حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور آپ کے رفقارکار۔ اس اجمال کی تفصیل جناب غلام رسول مہر کی زبانی سنئے۔ مہر صاحب لکھتے ہیں

سید صاحب سرحد تشریف لائے تھے تو آپ کو یقین ہوگا کہ شرع شریف کے احکام کی پابندی اور اسلامیت پر فداکاری میں اہل سرحد مسلمانان ہند سے فائق و برتر ہوں گے لیکن یہاں پہونچ کر دو برس تک ایک ایک طبقے کے احوال و مراسم دیکھ چکنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اسلام بھی رسمی ہے۔ اور واقعہ بھی یہی تھا کہ اس وقت اہل سرحد کی زندگی جاہلیت کے الواث سے آلودہ تھی، لہذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ سر و سامان جہاد کے ساتھ ساتھ انھیں اسلامیت کا پابند بنایا جائے، چنانچہ طے یہ پایا کہ امامت جہاد کی بیعت کے ساتھ ساتھ سب سے اقامت شریعت کی بیعت بھی لی جائے، پٹھانوں کی اصلاح و تنظیم کے سلسلے میں یہ دوسرا قدم تھا۔

چنانچہ فیصلہ کے مطابق کام کا آغاز کر دیا گیا اور منفرداً ہزاروں آدمیوں نے سید صاحب کی اس دعوت کو قبول کرلیا، لیکن اصل غرض انفرادی قبول و پذیرائی سے پوری نہیں ہوسکتی تھی، ضروری تھا کہ ایک ہمہ گیر نظام پیدا کیا جائے اس مقصد کے لئے علماء و اکابر کا اجتماع ضروری تھا، اس اجتماع کے لئے موزوں مقام پنجتار سمجھا گیا، چنانچہ سید صاحب اپنی جماعت کے ساتھ رئیس پنجتار فتح خان کی دعوت پر وہاں پہنچے اور پہنچتے ہی بیعت شریعت کیلئے

دعوت عام کا سلسلہ شروع کردیا، اس سلسلے میں آپ مختلف بستیوں اور قبیلوں میں دورے فرماتے اور علماء واکابر کو جمع کرکے پابندی احکام اسلام کی ہدایت کرتے، دوروں اور وعظ ونصیحت کے ذریعہ سے قبول عام کا جذبہ بیدار ہوگیا تو فیصلہ ہوا کہ پنجتار میں اجتماع عظیم منعقد کیا جائے، جس میں سرحد کے ہر حصے سے علماء وخوانین شریک ہوں، یکم شعبان ۱۲۴۴ھ (۶ فروری ۱۸۲۹ء) کی تاریخ اور جمعہ کا دن اس اجتماع کے لئے تجویز ہوا، خوانین واکابر کے علاوہ دو ہزار کے قریب علماء اس موقع پر آئے اتنے ہی ان کے تلامذہ تھے (بعض مکاتیب میں ہے قریب ہزار علماء وطلباء) اس اجتماع میں سید صاحب نے ایک افتتاحی تقریر فرمائی، جس کے آخر میں رئیس پنجتار کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اگر آپ ہماری بات ماننا چاہتے ہیں تو اسی مجمع میں مان لیجئے، ورنہ اتحاد کا رشتہ کٹ جائے گا، میں خدائے عزوجل کا ایک عاجز بندہ ہوں، میری آرزو اسکے سوا کچھ نہیں کہ سب لوگ احکام الٰہی کے فرمانبردار بنجائیں

تقریر پوری کرکے سید صاحب خود مجمع میں سے اٹھ گئے، علماء آپس میں مشورہ کرتے رہے، آخر اس فیصلے پر پہنچے کہ "نظام شرعی کا قیام" لازم ہے، نماز جمعہ کے بعد سب نے سید صاحب کے ہاتھ پر "اقامت شریعت" کے لئے بیعت کی،

استفتاء اور اس کا جواب

بیعت کے بعد ایک استفتاء علماء کی خدمت میں پیش کیا گیا جسکا مضمون یہ تھا کہ "اگر کوئی شخص امام کی بیعت کرنے اور اس کی اطاعت اپنے اوپر لازم کرلینے کے بعد خدمت دین اور اجرائے شرع مبین کے سلسلے میں امام کے کسی حکم کو رد کردے اور مخالفت پر کمربستہ ہوجائے، بلکہ جدال وقتال میں بھی متأمل

نہ ہو تو اسکے اور اس کے ساتھیوں کے لئے شریعت کا فیصلہ کیا ہے؟
علمار نے غور و فکر کے بعد اس کا مفصل جواب مرتب کیا، اس کے مطالب کا خلاصہ یہ تھا۔

۱ــــ اثبات امامت کے بعد حکم امام سے سرتابی سخت گناہ اور قبیح جرم ہے
۲ــــ مخالفوں کی سرکشی اگر اس پیمانے پر پہنچ جائے کہ قتال کے بغیر اس کا استیصال ممکن نہ رہے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان مخالفوں کی تادیب کے لئے تلواریں نکالیں اور امام کے حکم کو بزور مخالفوں پر نافذ کریں،
۳ــــ اس معرکے میں لشکر امام سے جو شخص قتل ہوگا وہ شہید سمجھا جائیگا اور لشکر مخالف کے مقتولین مردود و ناری متصور ہوں گے۔

اس فتوے پر علمائے سرحد میں سے پچیس افراد کے دستخط تھے۔

اصلاح عام غالبًا ۱۵ شعبان ۱۲۴۴ھ کو جمعہ کے دن (۲۰ فروری ۱۸۲۹ء) پھر ایک اجتماع ہوا جو فتح خاں رئیس پنجتار کے قبیلے کے افراد پر مشتمل تھا، خان نے ان سب کو بیعت کی ترغیب دی اور انھوں نے بطیب خاطر نظام اسلامی کی پابندی قبول کرلی، پھر مختلف علاقوں کے لئے سید صاحب نے قاضی مقرر فرما دیئے، مولوی سید محمد حبان کو قاضی القضاۃ بنایا گیا، ملا قطب الدین ننگرہاری کو احتساب کا کام سونپا گیا اور تیس تفنگچی ان کے ساتھ مقرر کئے گئے وہ قریہ قریہ اور دیہ دیہ دورہ کرتے رہتے جہاں کوئی امر خلاف شرع پاتے اس کا انسداد کرتے۔

نظام امارت کا اثر راویوں کا بیان ہے کہ تھوڑی ہی مدت میں پورے علاقے کی کایا پلٹ گئی، تمام لوگوں نے شریعت کی پابندی اختیار کرلی، پٹنہ داریاں ٹوٹ گئیں مقدمات کے فیصلے شریعت کے

مطابق ہونے لگے، اگر ملا قطب الدین کے آدمی دوسرے کام کے سلسلے میں بھی کسی گاؤں میں جاتے تو گاؤں والے دوڑے ہوئے آتے اور بتاتے کہ یہاں کوئی بے نمازی نہیں رہا۔

ایک سوال | کیا بیعت اقامت شریعت کے بعد سید صاحبؒ کے اختیارات فرمانروائی میں کوئی اضافہ ہوا؟ اس کا جواب نفی میں ہے بیعت امامت نے سید صاحب کو نظم قوائے جہاد کا مجاز بنایا تھا، بیعت اقامت شریعت کی رو سے وہ اجرائے احکام شرعی کا مرکز بن گئے۔ رؤسار و خوانین پر صرف اس حد تک پابندیاں عائد ہوئیں جو از روئے شریعت حقہ ضروری تھیں لیکن ان کی ریاستیں اور سرداریاں بدستور قائم رہیں[1]

یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ بیعت شریعت، بیعت جہاد سے الگ ہے، چنانچہ غلام رسول مہرؔ نے بھی اس پر تنبیہ کی ہے، وہ بیعت جہاد کی بحث کو ختم کرکے حاشیہ پر لکھتے ہیں، "یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ بعض سوانح نگاروں نے بیعت امامت جہاد اور بیعت اقامت شریعت کو مخلوط کر دیا ہے، حالانکہ دونوں بیعتیں الگ الگ موقعوں پر ہوئی تھیں اور ان میں کم و بیش دو سال دو مہینے کا فصل ہے۔"[2]

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بیعت امامت جہاد کی سرگذشت کا بھی خلاصہ پیش کر دیا جائے تاکہ دونوں کا فرق علی وجہ البصیرۃ منقح ہوکر معلوم ہو جائے۔

بیعت امامت جہاد | بیعت امامت جہاد کے سلسلہ میں مولانا علی میاں

---

[1] سیرت احمد شہید ج ۲ ص ۸۳ تا ۸۷ و سید احمد شہید ج ۲ ص ۵۵ تا ۶۵ [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۸۰

لکھتے ہیں۔

اکوڑے اور حضرو کے چھاپے کے واقعات سے صاف تجربہ ہوگیا کہ ملکی لوگ کسی نظام اور ضابطے کے پابند نہیں، جنگ کے موقع پر وہ فوراً لوٹ پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور مال غنیمت شرعی اصول پر تقسیم نہیں ہوپاتا۔ اس لئے علمائے لشکر کا بالاتفاق فیصلہ ہوا کہ سب سے ضروری اور مقدم کام یہ ہے کہ اپنا ایک امام مقرر کیا جائے تاکہ اس کی قیادت و امامت میں شرعی جہاد ہو محض لوٹ مار نہ ہو (سیرت احمد شہید ج۱ ص ۵۲۱)

غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

کاروبار جہاد کی تنظیم کے لئے علماء و خوانین کے ساتھ برابر باتیں ہوتی رہتی تھیں، تاآنکہ اس مسئلے کے شرعی اور انتظامی پہلو خوب واضح ہوگئے تو فیصلہ ہوا کہ جہاد کے لئے ایک امام کا انتخاب ضروری ہے اور اس منصب جلیل کے اہل صرف سید صاحبؒ ہیں چنانچہ ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ (۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء) کو جمعرات کے دن ہنڈ کے تالاب کے کنارے سادات کرام، علماء عظام، مشائخ ذوی الاحترام، امراء عالی مقام و سائر خواص و عام نے سید صاحب کے ہاتھ پر امامت جہاد کی بیعت کرلی، اور اگلے روز جمعہ کے خطبے میں سید صاحب کا اسم گرامی شامل ہوگیا (سید احمد شہید ج۱ ص ۳۰۴، ۳۰۳)۔

اس بیعت امامت پر سید صاحب کے زمانے ہی میں جو اعتراضات ہوئے اور ان کے موقف کی تضعیف کے لئے جو شبہات پیش کئے گئے ان اعتراضات میں سے بعض کی کیفیت یہ تھی۔

ا۔ سید صاحب اور ان کے رفقاء پر ذاتی اعتراضات جن کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

۲ ـــــ جہاد کے لئے امام جامع الشروط ہونا چاہئے، سید صاحب میں یہ شرطیں نہیں پائی جاتیں، بالخصوص جس قوت سے مقابلہ ہے اس کے اعتبار سے ان کے پاس طاقت و شوکت اور ساز و سامان نہیں ہے۔

۳ ـــــ بعض لوگ بیعت کر لینے کے بعد منحرف ہو گئے اس لئے بقیہ کی استقامت بھی مشتبہ ہے

مہر صاحب لکھتے ہیں۔

ان اعتراضات کا مقصد محض یہ تھا کہ جو کام ہو رہا تھا اسے نہ ہونے دیا جائے، میر شاہ علی نامی ایک شخص نے حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے پاس خط لکھ کر یہ درخواست کی کہ ان اعتراضات کے جواب میں ایک رسالہ تحریر فرما دیا جائے تاکہ اس کے ذریعہ معترضین کا رد کیا جا سکے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کے جواب میں ایک مبسوط خط تحریر فرمایا جو بیش بہا علمی دینی اور فقہی فوائد پر مشتمل ہے، جس کا یہاں نقل کیا جانا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔

حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ کا مکتوب گرامی

"بندۂ ضعیف محمد اسمٰعیل کی طرف سے بخدمت معدن غیرت ایمانی، منبع حب اسلامی، مقبول بارگاہ رب قوی میر شاہ علی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ سلام مسنون و دعائے اجابت مقرون کے بعد واضح ہو کہ آپ کا وہ گرامی نامہ پہنچا، جس میں چند مخلصین اور بعض منافقین کے ایک مباحثے کا تذکرہ ہے، منافقین سے آپ جو جہاد باللسان کر رہے ہیں اور راہ ایمان کی طرف طالبین کو جو دعوت دے رہے ہیں، اس پر اللہ آپ کو جزا خیر دے۔!

آپ نے تحریر کیا ہے کہ سوال و جواب کے مضامین منقح کرکے اور انھیں ایک رسالہ میں ضبط کرکے آپ کو بھیجدوں، تو مخدوم من! اگرچہ ان مسائل میں تقریر و تحریر بھی جہاد کی ایک قسم ہے، لیکن یہ ضعیف، بلکہ اس مقام کے تمام حاضرین ایسے کام میں مشغول ہیں کہ تقریرات و تحریرات کی اس میں قطعاً گنجائش نہیں ہمارا حال اہل تقریر و تحریر کی نسبت بالکل ایسا ہے کہ ایک شخص خود نماز کی ادائیگی میں مشغول ہے تو اگرچہ نماز کے مسائل کی تعلیم بھی مقدمات صلوٰۃ میں سے ہے لیکن ادائے نفسِ صلوٰۃ، مسائل صلوٰۃ کی تعلیم میں مشغول ہونے سے مانع ہے، جو شخص مجاہدین کا حال دیکھے اس کو یقین ہو جائے کہ بحث و جدال کا مسلک خواہ وہ حق ہو یا باطل دوسرا ہے اور ان لوگوں کا مسلک دوسرا، پہلا مسلک علما کی جنس سے ہے اور دوسرا سپاہ کی جنس سے "شتان بینہما"، آپ کی خاطر چند کلمات لکھے جاتے ہیں۔

مولانا شہیدؒ نے اس تمہید کے بعد اصل موضوع پر بحث کی ہے، پہلے اعتراض یعنی سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کی طرف ذاتی قسم کے عیوب کی نسبت تحریر فرماتے ہیں۔

۱ ـــــ حدیث و کلام و فقہ کے مطابق امیر المومنین کی بیعت کے انعقاد میں قطعاً کوئی شبہ نہیں، باقی مخالفین آنجناب یا آپ کے رفقاء کے متعلق جن قبائح کا ذکر کرتے ہیں تو آپ کی ذات سے متعلق ان قبائح کی نسبت سراسر باطل اور صداقت سے خالی ہے، اور جو باتیں آپ کے رفقاء کی جانب منسوب کی جاتی ہیں تو ان کا بھی بیشتر حصہ واقعہ کے مطابق نہیں ہے برتقدیر تسلیم رفقائے امام کی خرابی امام کی امامت میں ہرگز قادح اور اثر انداز نہیں جیسے کہ امتیوں کی خرابی نبی کی نبوت پر ہرگز اثر انداز نہیں، آپ کی ذات سے

متعلق جن چیزوں کی نسبت کرتے ہیں، ان کے تسلیم کر لینے کے بعد بھی ثبوت امامت پر قطعًا اثر نہیں پڑتا، اس لئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مراتب ولایت کے خلاف پڑتی ہیں اور مراتب ولایت کا ثبوت سرے سے امام کی شرائط میں سے نہیں ہے، بلکہ فسق وظلم بھی ثبوتِ امامت کے بعد اس کے زوال کا سبب نہیں بنتا۔ احادیث متواترہ اور متقدمین ومتاخرین وفقہائے متکلمین کی عبارات اس پر دلیل ہیں۔

مختصراً گفتگو کا مدار دو باتوں پر ہے، ایک ثبوت امامت، دوسرے زوال امامت۔ اعتراضات مذکورہ کی وجہ سے پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ امامت کے ثبوت کے طریقے کی تحقیق حدیث، کلام وفقہ کی کتابوں سے کرنی چاہئے، اور اس مسئلے میں قوی وضعیف راجح ومرجوح روایات میں تمیز کرنی چاہئے اسکے بعد مضمون قوی کا خلاصہ ذہن نشین کر کے غور کرنا چاہئے کہ ہمارے اس مسئلے میں یہ بات پائی جاتی ہے یا نہیں، اگرچہ ان مسائل میں مشاہدے سے حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ "لیس الخبر کالمعاینۃ"۔ لیکن مشاہدۂ حال ان لوگوں کو میسر نہیں جو غیر موجود ہیں اس لئے اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ ان لوگوں کو اس مجمع اخیار کا مجملاً حال معلوم ہو اسی لئے اس مضمون کا ایک خط اور ان حالات کے چند اور خطوط آپ کی خدمت میں بھیجے جا چکے ہیں تاکہ کسی طرح حقیقت حال منکشف ہو جائے جو شخص بھی ان دونوں مقدموں میں اچھی طرح غور کرے گا اس کو یقیناً آنجناب کی امامت کے انعقاد کا اذعان ہو جائے گا،

رہا دوسرا مسئلہ (زوال امامت) تو اس کی بھی حدیث، کلام، فقہ کی کتابوں سے تحقیق کرنی چاہئے کہ کون سا امر امامت سے امام کی علیحدگی کا باعث ہوتا ہے یقین ہے کہ ان میں سے کوئی آنجناب میں نہیں پایا جائیگا، بلکہ وہ قبائح جو

منصب امامت سے امام کی علاحدگی کا باعث ہیں آپ کی شان سے اس قدر بعید ہیں کہ کافر سکھوں اور فرنگیوں میں سے بھی کوئی ان کی نسبت آپ سے نہیں کرسکتا، پھر جب کہ آپ کی امامت ثابت ہوگئی اور کوئی ایسا امر جو اس منصب سے علاحدگی کا سبب ہو نہ پایا گیا، پس آپ کی اطاعت تمام مسلمانوں پر واجب ہوئی جو آپ کی اطاعت سرے سے تسلیم ہی نہ کرے، یا تسلیم کرنے سے انکار کردے تو وہ باغی مستحل الدم ہے اس مسئلہ میں اس ضعیف کا یہی مسلک ہے اور معترضین کے اعتراضات کا جواب تلوار ہے نہ کہ تحریر وتقریر۔"

(۲) دوسرا اعتراض پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

(الف) "باقی آپ نے اس کا جو ذکر کیا ہے کہ مقابلے کے لئے فریق مخالف کی قوت جیسی قوت چاہیے، اوّل تو یہ مقدمہ ممنوع ہے، کیونکہ شوکت کی تحصیل کی کوشش بقدر استطاعت کافی ہے، مخالفین کی شوکت کے مماثل ہو یا نہ ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "واعدّوا لھم ما استطعتم" (پ ۱۰) یہ نہیں فرماتا واعدوا لھم مثل ما اعدّوا لکم"

(ب) دوسرا یہ کہ شوکت کے وجود کے یہ معنی نہیں کہ امام کے جسم میں ایسی قوت پیدا ہو جائے کہ وہ ایک لمحہ میں مخالفوں کی سلطنت درہم برہم کر ڈالے اور تنہا ان کے لشکروں کو بکھیر کر رکھ دے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے امام کے پاس ساتھیوں کی ایسی جماعت ہو کہ باعتبار ظاہر ان کی قوت سے مخالفین کی مدافعت کرسکے، اور اجتماع کا یہ مطلب نہیں کہ ہر وقت اسکے چاروں طرف وہ لوگ کھڑے رہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جماعت کو امام کی ذات سے ایسا تعلق ہو کہ اس تعلق کی بناء پر وہ اس کے احکام کی اطاعت کرنے لگیں،

جیسے سلاطین کے نزدیک صاحب شوکت وہ ہوتا ہے جس کے ہمراہ نوکروں کا کثیر گروہ ہوتا ہے اور افغانوں کی اصطلاح میں جس کی قوم اور برادری وسیع ہو وہ صاحب شوکت سمجھا جاتا ہے، اور شریعت کی نگاہ میں صاحب شوکت وہ شمار ہوتا ہے جس کے ہاتھ پر کثیر مسلمانوں نے بیعت کی ہو، کیونکہ بیعت کا رشتہ شریعت میں ملازمت و قرابت کے رشتوں سے قوی مانا گیا ہے، پس امام ہمام کو بالفعل اس درجے کی شوکت شرعی حاصل ہے، جو مخالفین کی شوکت سے کئی درجے زیادہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ باقی رہا یہ کہ بعض لوگوں نے بیعت توڑ دی ہے اور احتمال ہے کہ دوسرے بھی یہی معاملہ کریں تو یہ بات شوکت شرعیہ میں اصلاً قادح نہیں، اسلئے کہ بہت سے نوکر نمک حرامی اور آقا کی بدخواہی کرتے ہیں، اور احتمال ہوتا ہے کہ دوسرے بھی یہی طریقہ اختیار کریں تو جس طرح یہ بات سلاطین کی شوکت عرفیہ میں قادح نہیں اسی طرح یہ احتمال ائمہ کی شوکت شرعیہ کے بھی منافی نہیں۔

(ج) تیسری بات یہ ہے کہ مشرق و مغرب کے کفار کی شوکت کے مماثل شوکت مراد نہیں، ورنہ اگلے پچھلے اماموں میں سے کسی کی امامت ثابت نہیں ہوگی، پس اس سے مراد صرف یہ ہے کہ ان مخالفین کی شوکت کے برابر شوکت ہو جو عملاً مقابل ہیں اور اس وقت یہ شوکت محقق ہے، یعنی ضلع چھچھ، ہزارہ اور پکھلی کے ناظموں کی شوکت کے مماثل شوکت موجود ہے، اگرچہ رنجیت سنگھ اور کمپنی (ایسٹ انڈیا کمپنی) کی شوکت کے مماثل نہ ہو، کس شخص نے آپ کو خبر دی ہے کہ جناب امام ہمام اسی مختصر سی جمعیت کے ساتھ لاہور اور کلکتہ کا عزم رکھتے ہیں؟ آپ تو رات دن مسلمانوں کی جمعیت کی زیادتی اور ان کی شوکت کی ترقی کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اور اسلامی شوکت کے عروج کی تدریجاً امید رکھتے ہیں،

اور یہ بات بالکل مستبعد نہیں، بلکہ قوموں اور حکومتوں کے انقلاب میں اللہ کی یہ سنت جاری ہے کہ معمولی لوگوں میں سے کوئی کمزور فرد جیسے "نادر شاہ" وغیرہ سر اٹھاتا ہے اور آہستہ آہستہ رفقار کی ایک جماعت فراہم کرلیتا ہے اور تدریجاً قوت و شوکت حاصل کرلیتا ہے، یہاں تک کہ بڑے بڑے سلاطین کی سلطنت درہم برہم کردیتا ہے، کس قدر بے انصافی ہے کہ جو شخص محض دنیا کی طلب میں کمربستہ ہوتا ہے، اس کے حق میں فتح و نصرت کا گمان کرلیا جاتا ہے اور اسی گمان پر اس کا ساتھ دیا جاتا ہے، لیکن جو شخص محض اللہ کے لئے اور اللہ کی خوشی کے لئے دین کی مدد کے لئے کھڑا ہوتا ہے اس کے حق میں فتح و نصرت کا حصول مستبعد سمجھا جاتا ہے اور اس پر عجیب عجیب اشکالات اور قسم قسم کے اعتراضات کئے جاتے ہیں، اس کا کوئی ساتھ نہیں دیتا اور عام مسلمانوں کو بھی اس کی رفاقت سے روکا جاتا ہے اور نوبت بایں جارسید کہ اسکے کارخانۂ جہاد کو درہم برہم کرنے کی سعیٔ نامشکور کی جاتی ہے" الا لعنة الله على الظالمين الذين يصدون عن سبيل الله ويبغونها عوجا" (۱۱: ۱۸-۱۹)

(ک) چوتھے یہ کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ شوکت قویہ کا حاصل ہونا اہل شوکت کے ساتھ جہاد کی شرط ہے اور یہ شوکت آنجناب کو حاصل نہیں، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ امام وقت کے لئے شوکت حاصل کرنے کا طریقہ آخر کیا ہے، کیا شوکت اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ ایک شخص ماں کے پیٹ سے فوجوں اور سامان جنگ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، یا جس وقت جہاد کرنے کے لئے مستعد ہوتا ہے اسی وقت غیب سے تمام لشکر اور سامان جنگ عطا ہوجاتا ہے؟ یہ بات نہ کبھی ہوئی ہے اور نہ کبھی ہوسکتی ہے، اس کا طریقہ یہی ہے کہ جس طرح امام کا مقرر کرنا تمام مسلمانوں کا فرض ہے اور اس میں مداہنت معصیت ہے، اسی طرح امام وقت کے لئے شوکت

کا فراہم کرنا بھی ان کا فریضہ ہے مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کے گرد جمع ہو جائیں اور ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق سامان جنگ فراہم کرنے کی کوشش کرے، اسی لئے آیت کریمہ "واعدوا لھم ما استطعتم" اور آیت پاک "جاھدوا باموالکم وانفسکم" میں تمام مخاطبین کو خطاب ہے، نہ کہ صرف ائمہ کو۔ پس ہر وہ شخص جو کہتا ہے کہ شوکت امام جہاد کی شرط ہے اور یہ شوکت ہم کو حاصل نہیں اس کو لازم ہے کہ پہلے خود آئے اور بقدر استطاعت سامان جنگ اپنے ساتھ لائے، اس معاملے میں کسی دوسرے کی شوکت کا انتظار اصلا جائز نہیں، جس طرح نماز جمعہ کی ادائیگی ہر شخص پر واجب ہے اور اس کا ادا کرنا بغیر جماعت کے متصور نہیں اور انعقاد جماعت بغیر امام کے ممتنع ہے، پس اگر ہر شخص گھر میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہے کہ جب امام آجائیگا، جماعت موجود ہو جائے گی میں بھی حاضر ہو جاؤں گا تو یقیناً جمعہ کی نماز فوت ہو جائیگی اور ہر شخص گنہ گار ہوگا، اس لئے کہ ارواح مقدسہ میں سے کسی امام کا اترنا اور فرشتوں کی جماعت میں سے کسی جماعت کا جمعہ قائم کرنے کے لئے آنا ہونے والی بات نہیں، اس کا طریقہ یہی ہے کہ ہر شخص اپنے گھر سے خواہ تنہا ہو باہر آئے اور مسجد میں جائے اگر جماعت مجتمع ہو تو اس میں شریک ہو جائے ورنہ مسجد میں بیٹھا دوسرے کا انتظار کرے اگر اس نے مسجد خالی دیکھ کر گھر کا رستہ لیا تو جمعہ کی جماعت و امامت قائم ہو چکی! اسی طرح لازم ہے کہ ہر شخص اگرچہ تنہا، کمزور قلیل الاستطاعت ہو، امام کی دعوت کا آوازہ سنکر اپنے گھر سے نکل دوڑے اور اپنے سامان کے ساتھ مسلمانوں کی جماعت میں پہنچ جائے تاکہ جہاد کے قائم ہونے کی صورت پیدا ہو، نہ یہ کہ اپنے کو اللہ کے بندوں کے زمرے سے نکال کر ڈرپوک بندوں میں شامل کرے اور دین متین کے اس رکن رکین کو ہاتھ سے جانے دے سرکش دولت مندوں کی

کاسہ لیسی اور ناقص العقل عورتوں کی کنگھی چوٹی میں مشغول رہے۔
سبحان اللہ! اسلام کا حق یہی ہے کہ اسکے رکن اعظم کی جڑ کھود کر پھینک دی جائے، اور اس شخص کو جس کے سینے میں کمزوری و ناتوانی کے باوجود اسلامی حمیت جوش مار رہی ہے طعن و تشنیع کا ہدف بنا لیا جائے! محمدیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر کوئی شخص کھیل اور مذاق سے بھی جہاد کا نام لے لے، تو مسلمانوں کے دل سنتے ہی پھول کی طرح کھل جائیں اور سنبل کی طرح لہلہانے لگیں، اور اگر دور دراز کے مقامات سے بھی جہاد کا آوازہ اہل غیرت تک پہنچ جائے تو دیوانے وار دشت و کوہسار میں دوڑنے اور شہباز کی طرح اڑنے لگیں نہ یہ کہ جہاد کا مسئلہ اس عظمت کے باوجود کتاب الحیض والنفاس کی تعلیم و تعلم کے درجے سے بھی کم سمجھا جائے۔

مناسب یہ ہے کہ ان ہواجس نفسانی اور وساوس شیطانی کو دل سے دور کریں اور غیرت ایمانی اور اسلامی حمیت کو جوش میں لائیں اور مردانہ وار مجاہدین کے لشکر میں داخل ہو جائیں اور زمانے کے نشیب و فراز پر صبر کریں اور دور و دراز خیالات کو چھوڑیں اور دنیاوی تعلقات کو جو اس مشغولیت سے مانع ہوں خیر باد کہیں۔

مصلحت دید من آن ست کی یاران ہمہ کار
بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند

سیرت سید احمد شہیدؒ ج ۲ ص از ۵۳۳ تا ۵۴۰ و سید احمد شہید ج ۱ ص ۲۷۰ تا ۲۷۵ - (مع تغیر یسیر و حذف قلیل)

(۲) نظامِ امارت کی دوبارہ تاسیس

حضرت امام سید احمد شہیدؒ کے واقعہ شہادت (۲۴ ر ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ) کے بعد باقی ماندہ مجاہدین نے شیخ ولی محمد صاحب پھلتی کو (جو امام شہیدؒ کے مخصوص اصحاب میں تھے) اپنا امیر بنا لیا پھر ۱۲۵۰ھ میں جب شیخ نصیر الدین دہلویؒ داماد حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ (حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مرشد اول) مجاہدین کے مرکز استھانہ پہنچے تو تمام مجاہدین نے ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی اور انھیں اپنا امیر منتخب کر لیا، لیکن مجاہدین کی جماعت میں حضرت امام شہیدؒ کی غیبت و رجعت کے جدید نظریہ کی وجہ سے اجتماعیت قائم نہ رہ سکی اور جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، شیخ نصیر الدین دہلویؒ نے اگرچہ ان کے انتشار و اختلاف کے دور کرنے کی بہت کوشش کی مگر انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی جس کی بنا پر اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جدوجہد کا وہ سلسلہ جسے امام شہیدؒ نے جاری فرمایا تھا ان کی شہادت کے بعد منقطع ہو گیا تھا دوبارہ شروع نہ ہو سکا، مجاہدین کے اسی انتشار کے زمانے میں مولانا نصیر الدین دہلویؒ کا ۱۲۵۶ھ میں انتقال ہو گیا، انکے بعد مجاہدین کی قیادت و سیادت کی ذمہ داری مولانا ولایت علی صادق پوریؒ نے سنبھالی چونکہ نظریہ غیبت و رجعت کے مولانا زبردست حامی اور مؤید تھے اور اس عقیدہ کی رو سے امام شہیدؒ کے ظہور کے بعد انھیں کی معیت میں جہاد کیا جا سکتا تھا اس لئے ان کے عہد امارت میں بھی حضرت امام شہیدؒ کے عظیم مقصد کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ جو ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تھے انھیں ہندوستان میں دوبارہ اس بابرکت جدوجہد کو شروع کئے جانے کی

بڑی تمنا تھی اور اس کی تدبیروں پر اکثر غور و فکر کرتے رہتے تھے، یہی وہ زمانہ تھا جب سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ بغرض حج و زیارت حرمین شریفین پہنچے اور تقریباً دو سال اس ارض مقدس میں مقیم رہے، اس سفر میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کی مجلس میں حاضری اور ان سے استفادہ کا خوب خوب موقع ملا، چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے انھیں جوہر قابل پاکر ان کی تربیت کی جانب خصوصی توجہ فرمائی اور ہندوستان میں انقلابی جدوجہد کی ہدایات دے کر واپس بھیجا چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ نے انھیں خطوط پر جن کی ہدایات "شاہ صاحبؒ" نے فرمائی تھی ہندوستان آکر استاذ الکل مولانا مملوک علیؒ، مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ، مولانا احمد علی سہارنپوریؒ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ وغیرہ کے اشتراک و تعاون کے ساتھ کام شروع کردیا۔[1]

بالآخر ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء میں جب کہ برطانوی سامراج کے ظلم و تشدد کے خلاف برسوں کی سلگتی ہوئی آگ لاوا بن کر پھوٹ پڑی تو ان قافلۂ ولی اللہی کے مسافروں نے جو سالو . سے سامان سفر کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے تھانہ بھون کی ایک مسجد میں بیٹھ کر طے کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ " زمین اللہ کی حکومت بادشاہ کی اور حکم ایسٹ انڈیا کمپنی کا " کے جھوٹے دعوے کے خلاف اعلان کردیا جائے کہ " زمین اللہ کی، حکومت اللہ کی، اور حکم اللہ کا " ظاہر ہے کہ یہ اعلان کوئی معمولی اعلان نہیں تھا بلکہ ایک ایسی جابر و قاہر حکومت کے خلاف اعلان جنگ تھا جس کی وسیع سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر خوب غور و فکر کرنے کے بعد ایک تنظیم کے تحت یہ انقلابی

---

[1] ماخوذ از التمہید لتعرف ائمۃ التجدید، تالیف مولانا عبید اللہ سندھی ص ۳، ۴، ۵،

قدم اٹھایا جائے، مزید غور و فکر کی اس لئے بھی ضرورت تھی کہ اپنی ہی جماعت کے ایک بزرگ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بحالت موجودہ اس اقدام کے شدید مخالف تھے، تھانہ بھون کی اسی مسجد میں ایک بار پھر مجلس شوریٰ کے ارکان سر جوڑ کر بیٹھے،

اس مجلس شوری کا انعقاد کس تاریخ کو ہوا ارباب حل و عقد میں سے کتنے حضرات اس میں شریک ہوئے ان تفصیلات سے تاریخ کا دامن خالی ہے حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ کے بیان سے صرف درج ذیل اکابر کے ناموں کا پتہ چلتا ہے

(۱) حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ (۲) حضرت حافظ ضامن شہید صاحبؒ (۳) حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ (۴) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحبؒ (۵) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحبؒ — اول الذکر تین اکابر تو تھانہ بھون ہی میں پہلے سے موجود تھے البتہ آخر الذکر دو بزرگوں کو ان کے گھروں سے بلایا گیا تھا۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے کی کارروائی کی تفصیل خود حضرت مدنی قدس سرہٗ ہی کی زبانی سنی جائے کیونکہ اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی آپ کی قدآور شخصیت تھی، اس لئے ان سے زیادہ صحیح رپورٹ کون دے سکتا ہے، حضرت مدنی رحمۃ اللہ تحریر فرماتے ہیں۔

مجلس شوریٰ کی روداد

"جب ہر دو حضرات (مولانا نانوتوی و مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما) پہنچ گئے تو ایک اجتماع میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی حضرت نانوتوی رحمہ اللہ

نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا (چونکہ وہ چچا پیر تھے اس لئے ہمیشہ ان کا ادب کیا جاتا تھا) حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ و آلات جہاد نہیں ہیں، ہم بالکل بے سروسامان ہیں، مولانا نانوتوی رحمہ اللہ نے عرض کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا غزوۂ بدر میں تھا اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا، اس پر حافظ ضامن (شہید) صاحب نے فرمایا کہ بس مولانا سمجھ میں آگیا اور پھر جہاد کی تیاری شروع ہو گئی اور اعلان کر دیا گیا۔

حضرت حاجی صاحب کی امارت پر بیعت

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا، اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو میمنہ و میسرہ (فوج کے دائیں و بائیں بازو) کا افسر مقرر کیا گیا

عام مسلمانوں کی اطاعت

چونکہ اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے علم و تقویٰ (تصوف و شرع) کا بہت زیادہ شہرہ تھا، ان حضرات کے اخلاص اور للہیت سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے، ہمیشہ سے ان کی دینداری اور خدا ترسی دیکھتے رہے تھے اس لئے بہت تھوڑی مدت میں جوق در جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا . . . . مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے

تھانہ بھون اور اطراف میں اسلامی حکومت قائم کرلی گئی اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیئے گئے۔[1]

اس نظام امارت کا ذکر مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے بھی تذکرۃ الرشید میں کیا ہے مگر تذکرۃ الرشید ایسے زمانے میں ترتیب دی گئی ہے جب کہ واقعہ کو اس کے اصلی رنگ میں بیان نہیں کیا جاسکتا تھا، اس لئے مولانا میرٹھی نے اجمال و توریہ سے کام لیا ہے، ضرورت تھی کہ بعد کے ایڈیشنوں میں بات وضاحت کے ساتھ حاشیہ ہی میں صحیح طور پر بیان کردی جاتی مگر ناشروں کی سہل انگاری سے ایسا نہ ہوسکا، ظاہر ہے کہ اس مجمل اور تلمیح و توریہ کے پردے میں کہی گئی بات کو ماخذ نہیں بنایا جاسکتا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ نے بھی سوانح قاسمی بروایت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اس کا تفصیلی تذکرہ لکھا ہے، حضرت شیخ الاسلام اور حضرت قاری صاحب کے بیانات میں جزوی اختلافات پایا جاتا ہے، ہم نے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے بیان کو ترجیح دی ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنی مشہور تصنیف التمہید کے صفحہ ۷۹ پر لکھا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ مجھ سے بیان کیا تھا مگر حضرت شیخ الہندؒ نے کیا تفصیلات بیان کی تھیں مولانا سندھیؒ اس سے بالکل خاموش ہیں، کاش کہ مولانا ان تفصیلات کو بیان کردیتے تو ممکن تھا کہ اس واقعہ سے متعلق کچھ مزید باتیں منصۂ شہود پر آجاتیں۔

بادشاہ دہلی کی گرفتاری اور مجاہدین حریت کی ناکامی کے بعد اس نظام امارت

---

[1] نقش حیات ج ۲ ص ۴۲، ۴۳۔

کا شیرازہ بھی منتشر ہوگیا، جس کی تفصیلات مذکورہ بالا کتابوں بالخصوص نقش حیات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

(۳) تنظیم جماعت کی تیسری کوشش

اس ناکامی کے بعد اگرچہ حضرت شیخ الہند اپنے پورے عہد میں "ثمرۃ التربیت" "جمعیۃ الانصار" "نظارۃ المعارف" اور ریشمی رومال تحریک کے ذریعہ اسی متاع گم شدہ کی بازیافت میں کوشاں رہے، لیکن ۱۸۵۷ء کی تحریک کا ردعمل اتنا سنگین تھا کہ اس دور میں دین ومذہب کے نام پر کسی تنظیم کی تشکیل تو دور کی بات ہے زبان پر اس کا نام لانا بھی جرم عظیم تھا، اس لئے باقاعدہ طور پر نظام امارت کا قیام تو اس زمانہ میں نہیں ہو سکا پھر بھی حضرت شیخ الہند اپنے مخصوص ومعتمد تلامذہ اور متوسلین سے خفیہ طور پر احیاء دین کے لئے جدوجہد پر بیعت لیتے رہتے تھے، بانی تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی بھی ان معتمد تلامذہ کی فہرست میں شامل تھے جن سے یہ معاہدہ شرعی طے ہوا (مولانا محمد الیاس اور ان کی دعوت) لیکن آہستہ آہستہ جب شکوک وشبہات کے بادل کچھ چھٹے یا بالفاظ دگر جب مجاہدین حریت کے پے درپے حملوں سے برطانوی سامراج کی قوت میں اضمحلال پیدا ہوگیا اور اسیران ظلم وستم کو کسی حد تک امن واطمینان کی فضا میں سانس لینے کا موقع نصیب ہوا تو ۶۳ سال کے طویل عرصہ کے بعد ۱۹۲۰ء میں اسی بوڑھے مجاہد (جسے درازی عمر، کثرت امراض اور مالٹا کی تقریباً تین سالہ قید وبند کی صعوبتوں نے چارپائی پر لٹا دیا تھا لیکن اس کے حوصلے جوان اور عزائم بلند تھے) کی یہ آواز ہمارے کانوں میں گونجتی ہے۔ "میری چارپائی کو اٹھا کر جلسہ گاہ لے چلو، میں پہلا شخص ہوں گا جو اس امیر کے ہاتھ پر بیعت کرے گا" لیکن برا ہو ہم عہدوں کی چشمک

اور منافست کا کہ غیروں نے نہیں بلکہ خود اپنوں نے اس صدائے حیات افزا کو سنی ان سنی کر دیا۔ حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ اپنی ایک تحریر میں اسی تلخ حقیقت کا اظہار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"اگر علمار میں مداہنت و منافست نہ ہوتی اور صوفیا میں ارباباً من دون اللہ بننے کا شوق نہ ہوتا تو آج تمام ہندوستان ایک شرعی امیر کے تحت زندگی بسر کر رہا ہوتا اور اسلام کی حقیقی برکات سے متمتع ہوتا، ان کی روح حکومت کی غلامی سے آزاد ہوتی اگرچہ جسم غلامی میں مقید ہوتا"[1]

قصہ مختصر جب جمعیۃ علمار کے دوسرے اجلاس میں حضرت شیخ الہندؒ جیسی عظیم و ہمہ گیر شخصیت کی موجودگی اور ان کی شدید خواہش کے باوجود علمائے ذی مراتب امیر الہند کے انتخاب پر آمادہ نہیں ہوئے تو مولانا ابوالمحاسنؒ نے اپنی بصیرت سے اسی وقت بھانپ لیا کہ امیر الہند کا مسئلہ جلد طے ہونے والا نہیں ہے اس لئے انھوں نے صوبائی پیمانہ پر نظام امارت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اپنے صوبہ بہار میں اس کی داغ بیل ڈالنے کی مہم شروع کر دی چنانچہ ۲۳ ؍ ۲۴ ؍ شعبان ۱۳۳۹ھ ؍ ۲ ؍ ۳ مئی ۱۹۲۱ء کو دربھنگہ میں جمعیۃ علمائے صوبہ کے اجلاس عام کے موقع پر یہ تجویز منظور کی گئی۔

"صوبہ بہار و اڑیسہ (اس وقت اڑیسہ مستقل صوبہ نہیں بنا تھا بلکہ بہار ہی کا ایک جزو تھا) کے محکمہ شرعیہ کیلئے ایک عالم مقتدر شخص امیر منتخب کیا جائے جس کے ہاتھ میں تمام محاکم شرعیہ کی باگ ہو اور اس کا ہر حکم مطابق شریعت ہر مسلمان کے لئے واجب العمل ہو، نیز تمام

---

[1] حیات سجاد، ص ۱۰۷۔

علمار ومشائخ اس کے ہاتھ پر خدمت و حفاظت اسلام کے لئے بیعت کریں جو سمع وطاعت کی بیعت ہوگی جو بیعت طریقت سے الگ ایک ضروری اور اہم چیز ہے، جمعیۃ علمار متفقہ طور پر تجویز کرتی ہے کہ انتخاب امیر کے لئے ایک خاص اجلاس علمار بہار کا بمقام پٹنہ وسط شوال میں کیا جائے"۔[1]

حسب تجویز ۱۸ر۱۹ر شوال ۱۳۳۹ھ (۲۵ر۲۶ر جون ۱۹۲۱ء) کو یہ اجلاس پتھر کی مسجد پٹنہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں مولانا آزاد سبحانی اور مولانا سبحان اللہ خان کے علاوہ سو سے زیادہ صوبہ بہار کے علمار شریک تھے، چنانچہ اسی اجلاس کی دوسری نشست میں بالاتفاق شرکار اجلاس مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی کو امیر شریعت صوبہ بہار اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کو نائب امیر شریعت منتخب کیا گیا، ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا مبارک دن تھا جس میں باقاعدہ امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا جس کا سلسلہ بحمداللہ آج تک جاری ہے، اب تک یکے بعد دیگرے امارت کے منصب پر چار امرار کا انتخاب ہوچکا ہے اور یہ سب انتخاب جمعیۃ علمار ہی کی نگرانی میں ہوا ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

(۴) ایک اور صوبہ میں امیر کا انتخاب

صوبہ بہار میں انتخاب امیر اور نظام امارت کے قیام کے بعد حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہٗ کی انجمن "خدام الدین" کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۶ء کے موقع پر جس میں حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند

---

[1] تاریخ امارت ص ۵۸، ۵۹

حضرت مولانا محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ، حضرت مو، ا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا حسین علی بچھرانویؒ، حضرت مولانا علامہ محمد یو ے بنوریؒ، مولانا ظفر علی خاں اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے علاوہ پانچسو سے زائد علماء کرا اشریک تھے حضرت محدث کشمیری کی تحریک پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیر شریعت منتخب کیا گیا اور پہلی بیعت خود حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے کی تھی اس کے بعد بیعت عامہ ہوئی۔[1]

نظام امارت کی تشکیل جدید

نومبر ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی نہ صرف رائے بلکہ شدید خواہش کو جب روبعمل نہیں آنے دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۵ء تک مسلسل پچیس سالوں کی جد وجہد وسعی بلیغ (جس کا کچھ اندازہ اس زمانے کی جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کی تجاویز اور اجلاس عام کے خطبات سے لگایا جاسکتا ہے) کے باوجود مسلمانان ہند انتشار کے میدان تیہہ میں سرگرداں رہے، اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے، حتیٰ کہ ان کی اسی پراگندگی کی حالت میں ملک کے سیاسی افق سے آزادی کا سورج طلوع ہوگیا، جس نے اس منتشر و پراگندہ قوم کی راہ حیات کو اور مزید تاریک بنا دیا اور اس تاریکی میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، پہلے اگر جان و مال کو تاراج کیا جاتا تھا تو آج خود دین و مذہب پر ڈاکے ڈالے جا رہے ہیں، اسلامی شعار داڑھی پر قدغن لگائی جا رہی ہے، خدا کے آخری صحیفۂ ہدایت قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت پر پابندی عائد کرانے کے لئے قانونی بہانہ تلاش کیا جا رہا ہے، اسلامی عبادت گاہوں پر جابرانہ

---

[1] ماہنامہ الرشید ساہیوال شمارہ جمادی الاخری ۱۴۰۴ھ۔

قبضہ کی اسکیموں کو بروئے کار لانے کا عمل شروع کر دیا گیا ہے اور حد تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو دین و مذہب سے محروم کر دینے کے لئے حکومتی سطح پر قانون سازی کی مہم چلائی جا رہی ہے

ایسے سنگین حالات میں کیا اس جمعیۃ علماء ہند کے لئے خاموش بیٹھے رہنا درست ہوتا؟ جسے سلسلۂ ولی اللٰہی سے انتساب کا بجا طور پر فخر حاصل ہے اور جس کے اسلاف نے احیائے دین و اجرائے احکام اسلام کے پیش نظر نہ صرف نظام امارت کے قائم کرنے کا فتویٰ دیا بلکہ اپنے اپنے عہد میں بقائے اسلام و نفاذ شریعت کے لئے حکم خداوندی کے مطابق اس نظام کے جاری کرنے میں اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا، حقیقت تو یہ ہے کہ اس نظام کا بیڑا اٹھا کر جمعیۃ علماء نے اپنے انتساب کا حق ادا کر دیا ہے۔ اور "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا" کی دعوت عام دیکر ملت اسلامیہ ہند پر ایک عظیم احسان کیا ہے، کیونکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس وقت جس طوفان نے سر اٹھایا ہے اس کا مقابلہ متفرق ٹولیوں کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لئے اجتماعی قوت و طاقت کی ضرورت ہے اور یہ نظام امارت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

تنظیم امارت کی نزاکتوں کا احساس

جمعیۃ علماء کے ارکان کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ یہ ایک خالص دینی و شرعی تنظیم اور اس کے کچھ مخصوص شرعی تقاضے ہیں جن کی تکمیل کے بغیر یہ نظام اپنی اصلی شکل میں قائم نہیں ہو سکتا، اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ ارکان جمعیۃ کے علاوہ دیگر حضرات علماء کرام سے بھی اس مسئلہ میں مشورہ کر لیا جائے چنانچہ ستمبر ۱۹۸۶ء کو دفتر جمعیۃ علماء ہند میں علماء کرام کا ایک مخصوص اجتماع ۶ [illegible]

اور غور وفکر کے بعد تین حضرات کے علاوہ سب کی رائے یہی تھی کہ موجودہ حالات میں نظام امارت کا قیام ضروری ہے، پھر مزید اطمینان کے لئے جمعیۃ علماء ہند کے ناظم عمومی جناب مولانا اسرار الحق صاحب قاسمی نے ملک کے سات صوبوں کا دورہ کر کے وہاں کے اہم علماء اور معتمد اصحاب رائے سے تبادلۂ خیالات کیا جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ عام طور پر مسلمانوں کا دیندار طبقہ اس ضرورت کو محسوس کرتا ہے، اس ابتدائی صلاح ومشورہ کے بعد کل ہند امیر شریعت کے انتخاب کا دعوت نامہ جاری کیا گیا، اور ملک کے اہم علماء کے علاوہ، علوم اسلامیہ کے مراکز، اور تمام مسلم جماعتوں کے نام دعوت نامے بھیجے گئے، چنانچہ دعوت نامہ کے مطابق ۲ر نومبر ۱۹۸۶ء کو بوقت ۹ بجے مدنی ہال بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی میں یہ اجتماع منعقد ہوا جس میں دلی، یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، کیرالہ، گجرات، اڑیسہ، مہاراشٹر، راجستھان، ہریانہ، کرناٹک، آسام، مغربی بنگال، آندھرا چودہ صوبوں کے تین ہزار سے زائد نمائندے شریک ہوئے جس میں علماء ومفتیان، مصنفین، عصری درسگاہوں کے لکچرار اور پروفیسر، اسمبلی وپارلیمنٹ کے ممبران، ڈاکٹر، وکلاء، تجار غرضیکہ ہر طبقے کے نمائندے شامل تھے۔

ارباب حل وعقد کا اجتماع اور انتخاب امیر الہند

اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند کے صدر حضرت مولانا سید اسعد مدنی نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برپا فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان درپیش خطرات کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے شرعی امور کی تکمیل کے لئے ایک شرعی تنظیم ہو اور شرعی قوانین واحکام کو مسلمانوں کی زندگی میں جاری کرنے کے لئے کوئی باقاعدہ

نظام قائم کیا جائے، میں اس سلسلے میں ایک تجویز آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ آپ اس کے الفاظ کو غور سے سماعت فرمائیں اور غور و فکر کے بعد اپنی رائے دیں۔ تجویز حسب ذیل ہے۔

(الف):- ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ مسلمان بہت سے احکام ضروریہ پر عمل نہیں کر سکتے، اس لئے بحکم خداوندی واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا، اور بحسب تصریح فقہاء اسلام، مسلمانان ہند پر شرعًا واجب ہے کہ اس انتشار اور پراگندگی کے بجائے اپنے اندر شرعی اجتماعیت پیدا کرنے کے لئے اپنا ایک امیر منتخب کریں۔

ہندوستان کے اکابر علماء مثلاً محدث عصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نقشبندیؒ وغیرہ نے اپنے اپنے خطبات میں اس وجوب شرعی کی ادائیگی پر بہت زور دیا ہے، اسلئے مسلمانان ہند کا یہ نمائندہ اجتماع جو جمعیۃ علماء ہند کی دعوت پر یہاں جمع ہوا ہے ضروری سمجھتا ہے کہ پورے ملک کے لئے ایک "امیر الہند" کا انتخاب کرلیا جائے۔

(ب) اور امیر کے اختیارات و فرائض کے تعین اور تنظیم امارت شرعیہ کے قواعد و ضوابط کا مسودہ تیار کرنے کیلئے پانچ ارکان پر مشتمل ایک سب کمیٹی مقرر کرلیجائے۔

عام شرکاء اجلاس کے علاوہ حسب ذیل حضرات نے بطور خاص تجویز کی تائید کی۔

(۱) حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند (۲) حضرت مولانا شاہ عون احمد قادری خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ (۳) محمود پاشا قادری

تخت نشین درگاہ میراں حبیب اللہ قادری حیدر آباد (۴) جناب محمد حنیف دائما کمار ایڈوکیٹ گجرات (۵) مولانا معین الدین شیخ الحدیث مدرسہ امدادیہ مراد آباد (۶) مولانا احمد علی شیخ الحدیث دارالعلوم بانس کنڈی آسام (۷) مولانا محمد یوسف مغربی بنگال (۸) مولانا سراج الساجدین اڑیسہ (۹) حافظ محمد صدیق ایم،پی مراد آباد (۱۰) مولانا عبدالعلیم فاروقی دارالمبلغین پاٹا نالا لکھنؤ (۱۱) مولانا مسعود احمد اجین (۱۲) جناب عزیزالرحمٰن ایم،ایل،اے سابق وزیر اتر پردیش (۱۳) مولانا ہاشم قاضی شہر کوئمبٹور (۱۴) مولانا محمد مستقیم بمبئی،

تجویز کی تائید کے بعد حضرت مولانا سید اسعد مدنی نے امیر الہند کے منصب کے لئے محدث کبیر ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دامت برکاتہم کا نام نامی پیش کیا اور باتفاق رائے پورے اجتماع نے انھیں امیر الہند منتخب کر لیا۔

بعد ازاں حضرت مولانا شاہ عون احمد قادری نے نائب امیر الہند کے لئے حضرت مولانا سید اسعد مدنی کا نام پیش کیا، تمام شرکاء نے انھیں بھی باتفاق رائے نائب امیر الہند منتخب کر لیا۔

بیعت عام مذکورہ کارروائی کی تکمیل کے بعد نمائندہ اجتماع میں شریک ارباب حل و عقد نے نائب امیر الہند کے دست مبارک پر بیعت عام کی اور شرعی امور میں سمع و طاعت کا عہد کیا، چونکہ حضرت محدث کبیر مولانا اعظمی مدظلہ اپنی علالت کی وجہ سے اجتماع میں شریک نہیں ہو سکے تھے اس لئے نائب امیر الہند کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

یہ ۱۸۲۹ء سے لیکر ۱۹۸۶ء (۱۲۴۴ھ تا ۱۴۰۶ھ) تک ڈیڑھ صدی سے زائد کی ہندوستان میں نظام امارت کی مختصر تاریخ ہے، جس سے بخوبی اندازہ لگایا

جاسکتا ہے کہ علمارِ ہند نے اس شرعی ذمہ داری کو احوال وظروف کے مطابق ہر دور میں پورا کرنے کی کوشش کی ہے ؎

"خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را"

غیر مسلم سلطنت میں منتخب امیر کے صفات لازمہ

گذشتہ سطور میں اجمالاً یہ بات گذر چکی ہے کہ "امام وخلیفہ" کے اعتبار سے "امیر" کے فرائض واختیارات محدود و مختصر ہوں گے، اس لئے لازمی طور پر "امیر" کے صفات اور شرطوں میں بھی تخفیف ہوگی، کیونکہ کام اور ذمہ داری جس معیار اور حیثیت کی ہوتی ہے ازروئے عقل اسی کے لحاظ سے صلاحیت واستعداد مطلوب ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ رقمطراز ہیں

ان الولایۃ لہا رکنان	ولایت کے دو رکن ہیں، قوت، امانت
القوۃ والامانۃ۔ کما قال	جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔
تعالیٰ ان خیر من استاجرت	البتہ بہتر نوکر جس کو آپ رکھنا
القوی الامین، وقال صاحب	چاہتے ہیں جو زور آور، امانت دار
مصر لیوسف، انک الیوم	ہو" اور شاہِ مصر نے یوسف
لدینا مکین امین، وقال	علیہ السلام سے کہا، "واقعی آج
تعالیٰ فی صفۃ جبرئیل	سے آپ ہمارے نزدیک باعزت
انہ لقول رسول کریم	معتبر ہیں" اور اللہ تعالیٰ نے جبرئیل
ذی قوۃ عند ذی العرش	کے صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا
مکین مطاع ثم امین"	"بے شک یہ قرآن کہا ہوا ہے باعزت
والقوۃ فی کل ولایۃ	رسول کا (جو) قوت والا، مالک

بحسبها فالقوة فی امارۃ
الحرب ترجع الی شجاعۃ
القلب، والی الخبرۃ بالحروب
والمخادعۃ فیها
والقوۃ فی الحکم بین الناس
ترجع الی العلم بالعدل
الذی دل علیہ الکتاب
والسنۃ والی القدرۃ
علی تنفیذ الاحکام
والامانۃ ترجع الی
خشیۃ اللہ والا یشتری
بامانۃ ثمنا قلیلا۱؎

عرش کے نزدیک صاحب مرتبہ
سب کا مطاع، وہاں کا معتبر ہے
اور قوت ہر ولایت میں ولایت
کے اعتبار سے ہوگی، لہذا جنگ
کے امیر میں قوت کا مرجع بہادری
لڑائی میں مہارت، اور جنگی تدبیریں
ہوں گی، اور لوگوں کے درمیان
فیصلہ میں قوت کا مرجع کتاب و
سنت سے ثابت شدہ عدل کا
جاننا اور احکام کے نفاذ پر قادر
ہونا ہوگا، اور امانت کا مرجع اللہ کا
خوف ہے کہ امانت کے سبب۔
دنیاوی مال واسباب کو (فیصلے
کے وقت) ترجیح نہ دے گا۔

۱؎ فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲۸ ص ۲۵۳

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ فرائض واختیارہی کے اعتبار سے شرائط وصفات ملحوظ ہوتی ہیں تو اب اس پر غور کرنا چاہیئے کہ اس "امیر" کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں ان کے متعین ہو جانے سے بدیہی طور پر اس کے شرائط وصفات کی تعیین ہوجائے گی۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک بار پھر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے فتویٰ کی جانب رجوع کرنا چاہیئے، شاہ صاحب اس میں لکھتے ہیں کہ "باجازت یا بہ حضور او (امیر) اقامت جمعہ واعیاد، وانکاح من لاولی من الصغار، وحفظ مال غائب وایتام، وقسمت ترکات متنازع فیہا علی حسب السہام فی نمودہ باشد"، یعنی امیر کی اجازت یا اس کی موجودگی میں جمعہ وعیدین کی اقامت، لاوارث بچوں کے نکاح کا انتظام، غائب اور یتیموں کے مال کی حفاظت، اور میت کے ترکہ میں پیداشدہ نزاع کا عادلانہ فیصلہ کیا جاسکے"، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس فتویٰ میں امیر کے جن منصب فرائض کا ذکر کیا ہے انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) اسلامی عبادات کی اقامت (۲) مسلمانوں کے عائلی معاملات کی انجام دہی (۳) مالی امور کا انتظام وانصرام اور اس سلسلہ میں پیش آمدہ مشکلات کا حل، یہ وہ امور ہیں جن کی انجام دہی امیر کے فرائض میں داخل ہے۔ اسی کے ساتھ حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کا یہ فتویٰ بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ یہ "امارت قہریہ" نہیں ہے، لہذا وہ تمام امور ومعاملات جن کا تعلق قوت اور جبر وقہر سے ہوگا وہ امیر کے فرائض سے خارج ہیں مثلاً سرحدوں کی حفاظت، ضرب وحرب، اجراء حدود وقصاص وغیرہ وہ امور جو قوت وشوکت کے متقاضی ہیں، امیر کے حدودِ فرائض میں شامل نہیں ہوں گے۔ ان ہر دو بزرگوں کے فتوے کی روشنی میں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ "امیر دارِ غیر" کے فرائض و اختیار "امام مطلق وخلیفۂ اعظم" کے اعتبار سے محدود ومختصر ہوں گے لہذا "والقوۃ فی کل ولایۃ بحسبہا" کے پیش نظر امیر کے اندر ان تمام صفات کا تلاش کرنا جو

امام مطلق کے لئے شرط قرار دی گئی ہیں اصولاً درست نہیں ہو گا۔ اسی لئے حضرت حکیم الامت نے امیر کے لئے صرف دو شرطیں بیان کی ہیں " عقل و تدین "، اور حضرت شاہ صاحب بھی دو ہی شرطوں کا ذکر اپنے فتوے میں کرتے ہیں یعنی امانت و تدین۔ یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ ان دونوں بزرگوں نے اس کیلئے اسلام، آزادی بلوغ کی شرطیں بھی ختم کر دی ہیں کیونکہ یہ شرطیں تو ذہناً متعین ہیں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی پھر تدین کے اندر علم کی شرط داخل ہے کیونکہ دین پر عمل بغیر علم کے ممکن نہیں ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امیر کی صفات لازمہ حسب ذیل ہوں گی (۱) مسلمان ہونا (۲) مرد ہونا (۳) آزاد ہونا (۴) عقلمند ہونا (۵) بالغ ہونا (۶) عالم ہونا (۷) دیندار ہونا (۸) امانت دار ہونا۔ اگر کسی کے اندر یہ مذکورہ صفات موجود ہوں تو اسے امارت کے منصب پر مقرر کرنا صحیح ہو گا۔

امیر کے فرائض

امیر کے فرائض حسب ذیل ہیں۔

(۱) احیائے دین و اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرنا۔

(۲) مسلمانان ہند کو متحد و متفق رکھنے کیلئے بقدر امکان کوشش کرنا۔

(۳) مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی، تعلیمی اور اقتصادی حالت کو درست کرنے کی جدوجہد کرنا اور اس کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرنا۔

(۴) اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کو تقریر و تحریر اور قانونی و جمہوری ذرائع کو اختیار کر کے دفع کرنے کی سعی کرنا۔

(۵) مخالفین اسلام کی طرف سے دین و شریعت کے خلاف پیش کردہ شبہات و اعتراضات کا تقریر و تحریر کے ذریعہ جواب دینا۔

(۶) مسلمانوں کے عائلی و معاشرتی امور کی اصلاح و حفاظت کی جدوجہد کرنا، اور

محکمۂ شرعیہ قائم کرکے پیش آمدہ عائلی مسائل کو حل کرنا۔

(۷) مسلمانوں کے باہمی نزاعات کا قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں عادلانہ فیصلہ کرنا۔

(۸) بیت المال کے ذریعہ زکوٰۃ کے جمع وصرف کا شرعی نظام قائم کرنا۔

(۹) مساجد، مدارس اسلامیہ، اور مسلم اوقاف کی حفاظت وصیانت اور اس سلسلے کے ضروری امور کا انتظام وانصرام کرنا۔

(۱۰) احکام شرعیہ کے نفاذ واجراء کے لئے مناسب اقدام کرنا۔

امیر کی حیثیت

مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحی فرنگی کے حوالہ سے ایک فتویٰ اگلے صفحات میں نقل کیا جاچکا ہے جس میں صراحتاً موجود ہے "لان الوالی کالسلطان فلا یجوز الا واحدا"۔ امیر مثل سلطان کے ہے لہذا جس طرح ایک سلطان کی موجودگی میں دوسرا مدعیٔ سلطنت قابل گردن زدنی ہے، اسی طرح ایک امیر کی امارت منعقد ہوجانے کے بعد کسی اور کو اس منصب پر بٹھانا ازروئے شرع درست نہیں ہوگا، البتہ امیر اپنی اعانت کے لئے اپنا نائب مقرر کرسکتا ہے۔

"الوالی کالسلطان" سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح سلطان کی اطاعت واجب ہے، امیر کی بھی واجب ہوگی، جن لوگوں نے امیر سے سمع وطاعت پر بیعت کرلی ہے ان پر امیر کے احکام وفرمان کی پیروی کا وجوب تو بالکل ظاہر ہے، کیونکہ بیعت حقیقتاً اطاعت کا عہد وپیمان ہے "ان البیعۃ ھی العھد علی الطاعۃ" (مقدمہ ابن خلدون ص ۱۴۰) اور عہد کا ایفاء شرعاً واجب ہے اور بلاوجہ شرعی اس کا نقض حرام ہے۔

اب باقی رہ جاتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے بیعت نہیں کی ہے، کیا ان کے لئے

بیعت کرنی ضروری ہے؟ فقہا کی تصریحات کے مطابق جب دارالکفر میں مسلمانوں پر نظام امارت قائم کرنا واجب ہے، اور اس کا قیام اسی وقت متحقق ہو سکتا ہے جبکہ ایک امیر پر سب لوگ جمع ہو جائیں اس لئے "ما یتوقف علیہ الواجب فھو واجب" کی رو سے تمام مسلمانوں پر امیر کی بیعت لازم ہونی چاہئے، علاوہ ازیں حکم باری تعالیٰ "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا" کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ مختلف جماعتوں اور ٹولیوں میں بٹے رہنے کے بجائے تمام مسلمان باہم مل کر ایک جماعت ہو جائیں جس کی عملی صورت یہی ہے کہ امیر واحد کے گرد تمام مسلمان اکٹھا ہو جائیں۔

علاوہ ازیں قرآن و حدیث کی جن نصوص میں امیر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے ان میں کسی خاص امیر کی قید نہیں ہے، مثلاً آیت کریمہ "یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" میں جمع کا صیغہ استعمال فرمایا گیا ہے جس میں بلا تخصیص تمام امراء داخل ہیں۔ خواہ وہ امام وخلیفہ کے مقرر کردہ ہوں یا ضرورت شرعیہ کی بنا پر خود مسلمانوں نے منتخب کیا ہو، اسی طرح حدیث پاک "ومن یطع الامیر فقد اطاعنی، ومن یعص الامیر فقد عصانی" میں الامیر کو مطلق رکھا گیا ہے، نیز ارشاد نبویؐ "اسمعوا و اطیعوا و ان استعمل علیکم عبد حبشی کأنّ راسہ زبیبۃ" سے بھی اطاعت کی تاکید اور عموم مفہوم ہوتا ہے، اس لئے دارالاسلام کا امام وخلیفہ ہو یا اس خلیفہ کے مقرر کردہ امراء، یا دارالکفر میں اصول شرعی کے مطابق مسلمانوں کے منتخب امیر سب کی اطاعت علی حسب المراتب لازم و ضروری ہو گی اور اس سے انحراف شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے۔

اشکالات واعتراضات کا جائزہ

امارت شرعیہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہندوستان میں اس نظام کے اجراء کی جب بھی کوشش کی گئی ہے بعض لوگوں کی طرف سے اس پر اعتراضات و اشکالات بھی اٹھائے گئے ہیں، اور بالعموم ہر دور میں ان اشکالات کی نوعیت قریب قریب یکساں رہی ہے، البتہ معترضین کے مزاج و افتاد طبع کے اعتبار سے ان کے اسلوب وطرز بیان میں فرق ضرور رہا ہے۔ کچھ اسی طرح کی صورتِ حال اس وقت بھی نظر آرہی ہے کہ ۲ر نومبر ۱۹۸۶ء کو انتخاب امیر کے بعد اس انتخاب پر اعتراضات واشکالات شروع کردئے گئے ہیں۔
ان اشکالات کرنے والوں میں کچھ حضرات تو وہ ہیں جنھوں نے اس خالص علمی وفقہی مسئلہ پر اپنی بحث وگفتگو کو علم واستدلال کے دائرے میں محدود رکھا ہے، لیکن ان میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے اس مسئلہ کو اپنے نظریاتی وجذباتی اختلاف کے اظہار کا ذریعہ بنالیا ہے، اس طبقہ کے افراد اصولی و استدلالی انداز اختیار کرنے کے بجائے تنقید وتبصرہ، طنز وتشنیع اور صحافتی بھبتیوں پر اپنے دماغ اور قلم کی توانائی خرچ کررہے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں کا جواب سوائے دعائے ہدایت کے اور کیا ہوسکتا ہے! لیکن جن حضرات کے اشکالات علم واستدلال کی بنیاد پر ہیں ان کا حق ہے کہ علم واستدلال ہی کی روشنی

میں ان کے خدشات دور کئے جائیں اور انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کیجائے اس وقت احقر کے سامنے اس قسم کے جتنے اعتراضات واشکالات ہیں اس کتابچہ میں ان سب کا حل موجود ہے، بلکہ اگر پورے رسالہ کا مطالعہ غور سے کرلیا جائے تو سرے سے یہ اشکالات پیدا ہی نہیں ہوں گے پھر بھی تبرعاً کچھ باتیں یہاں عرض کی جارہی ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

ایک صدر مفتی صاحب کے اشکالات

ایک مشہور ادارہ کے صدر مفتی نے دفتر امارت شرعیہ کو ایک طویل تحریر ارسال فرمائی ہے جسے بعد میں اس ادارہ کے مجلہ .... میں بھی "ایسے امیر مطلق کی شرعی حیثیت محلِّ نظر ہے اور اس کے یہ اسباب ہیں" کے جلی عنوان سے شائع کردیا گیا ہے۔ اس طویل تحریر میں جن اسباب وجوہ کو بیان کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ جو انتخاب امیر دہلی سے ابھی ماضی قریب میں ہوا ہے وہ شرعی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے، پھر اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں شامی اور شرح عقائد نسفی کے اقتباسات پیش فرماتے ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ انعقادِ امارت کیلئے کچھ شرطیں ہیں جن کا وجود بامکان عادی بحالت حاضرہ ممکن نہیں ہے لہذا جب شرط مفقود ہے تو امارت کا وجود جو ان شرطوں پر موقوف ہے کیونکر وقوع میں آسکتا ہے۔

۲۔ مولانا مفتی نظام الدین صاحب نے حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کے جس فتوے سے اس امارت کی صحت پر استدلال کیا ہے وہ استدلال بایں وجوہ بے بنیاد ہے (الف) یہ فتوی مدارس کے چندہ کے سلسلہ میں ہے اس میں امارت وامامت کا کوئی ذکر نہیں (ب) یہ حضرت سہارنپوری کا ایک خیال ہے جس کی تائید میں نہ تو کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی نص (ج) حضرت تھانوی کو اس سے اتفاق بھی نہیں

ہے (د) پھر دلیلِ عقلی سے بھی یہ استدلال باطل ہے۔ ان اسباب دوجوہ کو بیان کرنے کے بعد بطور نتیجہ کے لکھتے ہیں کہ "انہی شرائط کے فقدان کے باعث حضرت تھانوی، مدنی، شیخ الہند علیہم الرحمۃ وامثالہم نے اس طرح کی امارت کا خیال کبھی نہیں پکایا...... جب کبھی ان حضرات کے رو برو امارت وامامت کا مسئلہ خود ان کیلئے یا دوسروں کیلئے آیا تو صاف رد فرمادیا"۔

اس کے بعد اس امیر کی حیثیت بتانے کیلئے "علامہ ظفر احمد تھانوی" کی ایک عبارت پیش کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ جس امیر کو قوت منفذہ وشوکت قاہرہ حاصل نہ ہو اس کی حیثیت ایک "حکم" جیسی ہوتی ہے اور اسے امیر کہنا بھی مناسب نہیں لہٰذا عامۃ المسلمین پر نہ اس کی بیعت واجب ہے اور نہ سمع و طاعت اور نہ ہی اس کی معیت میں جہاد جائز ہوگا نیز نصب امیر کا فریضہ اس کی بیعت سے ادا نہ ہوگا۔

یہ ہے صدر مفتی صاحب کے اعتراضات واشکالات کا خلاصہ جسے خود موصوف ہی کے الفاظ میں اختصار کے ساتھ نقل کر دیا گیا ہے۔ اب ہم قارئین کی سہولت کے پیش نظر نمبروار ہر اشکال اور اس کے جواب کو ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

اشکال ۱:۔ جو انتخاب امیر دہلی سے ابھی ماضی قریب میں ہوا ہے وہ شرعی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے، کیونکہ انعقاد امارت کیلئے کچھ شرطیں ہیں جن کا وجود بامکان عادی بحالت حاضرہ ممکن نہیں ہے۔

جواب:۔ مفتی صاحب محترم کی اس تحریر اور اس میں پیش کئے گئے دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے حالات وامکنہ کے فرق کا لحاظ نہیں فرمایا ہے حالانکہ احوال وظروف کے اختلاف سے احکامات مختلف ہو جاتے ہیں۔ امیر شریعت کا یہ انتخاب جس ملک اور جن حالات میں کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ ان حالات میں تمام

فرائض کی انجام دہی کا امکان نہیں ہے، اس لئے بحالتِ موجودہ اگر کامل الاختیار وجامع الشرائط امیر کے بجائے ایسے امیر کا انتخاب کرلیا گیا ہے جس میں بعض شروط مفقود ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ کتب عقائد میں تو یہاں تک مصرح ہے کہ بعض حالات میں فاقد الشرائط (جس میں سب شرطیں موجود نہ ہوں) کا انتخاب واجب ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ کوئی جامع الشرائط نہ ملتا ہو تو ایسی صورت میں فاقد الشرائط کا انتخاب کیا جائے گا اور ایسا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے، اسی طرح اگر کسی امیر میں مثلاً ملک کے حالات کے لحاظ سے قوت قاہرہ نہ ہو تو اس ملک میں اس کا انتخاب جائز ہوگا اس لئے کہ جب قوت قاہرہ سے کام لینے کا امکان ہی نہیں ہے تو اس کا فقدان اس کے انتخاب میں مانع نہیں ہے شرح مواقف کی یہ تصریح انصاف کی نظر سے بغور پڑھی جائے۔

"لکن للامة ان ینصبوا فاقدها دفعا للمفاسد التی یندفع بنصبه" (ص ۳۲)

نیز "شرح عقائد" کی جس عبارت کو مفتی صاحب نے اپنے استدلال میں نقل کیا ہے اس کے تحت "صاحب نبراس" لکھتے ہیں۔

"ذکر المحققون انه اذا لم یوجد الامام الموصوف بهذه الصفات جاز نصب من لم یوصف ببعضها للضرورة، وهل یجب قیل لا. والمختار عندی الوجوب حفظا للشرع ودفعا للمضار، وهل یجب طاعته کما یجب طاعة الامام لم ار فیه کلاما والظاهر الوجوب حفظا للنظام"[1]

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ باستثناء خلفاء راشدین، حضرت امیر معاویہ وعمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہم اجمعین کے پورے دور خلافت (سنہ ۴۱ھ تا سقوط خلافت عثمانیہ ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۴ء)

---

[1] النبراس شرح شرح العقائد للنسفی (ص ۳۲۲)

میں حضرات متکلمین و فقہاء کی بیان کردہ شرائط کا جامع خلیفہ مشکل ہی سے ملے گا پھر بھی انکی خلافت کو امت باتفاق تسلیم کرتی ہے اور ان کی زیر حمایت جمع و جماعات اور اعلاء کلمۃ اللہ کا نظام بلا کسی نکیر کے ملت اسلامیہ میں قائم رہا اس لئے جب امام و خلیفہ کی شرائط میں ضرورۃً تسامح و تساہل سے کام لیا گیا ہے تو پھر ایک غیر مسلم ملک کے امیر پر اور ایسے حالات میں جب کہ امارت کے تمام فرائض کی ادائیگی کا سر دست امکان نہیں ہے آزاد اور با اختیار ممالک کے امراء کی جملہ شرطوں کو چسپاں کرنا صاحب بصیرت عالم و مفتی کی شان سے بعید ہے۔ اسی لئے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اس امیر کیلئے صرف امین و متدین ہونا کافی سمجھتے ہیں اور حضرت حکیم الامت تھانویؒ محض عقل و تدین کو اس امیر کیلئے شرط قرار دیتے ہیں۔[۱]

علاوہ ازیں ان ممالک میں جہاں کے مسلمان آزاد و خود مختار ہیں وہاں بھی بعض حالات میں حسب تصریح علماء متکلمین قوت و شوکت کی شرط نظر انداز کر دی جاتی ہے چنانچہ مشہور حنفی عالم علاّ ابو الشکور سالمیؒ ایک اشکال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قال بعض الناس بان الامام اذا لم یکن مطاعا فانه لا یکون اماما لانه اذا لم یکن له القهر و الغلبة لا یکون اماما لیس کذلک لان طاعة الامام فرض علی الناس	بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جب امام کی اطاعت نہ کی جائے تو وہ امام نہیں ہوگا کیونکہ جب اسے قہر و غلبہ حاصل نہیں، ہوا تو وہ امام نہیں ہوا، لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ امام کی

---

[۱] دیکھئے علی الترتیب فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۳۲ و امداد الفتاویٰ ج ۴ ص ۵۷۹۔

فلو لم يطيعوا الامام فالعصيان
حصل منهم وعصيانهم لا يضر
بالامامة ثم ان لم يكن القهر
فذلك من تمرد الناس وتمردهم
لا يعزله عن الامامة الا ترى ان
النبي عليه السلام ما كان مطاعًا
في اول الاسلام وكان لا يمكنه
القهر على اعدائه من طريق العادة
والكفرة قد تمردوا عن امداده و
نصرة دينه وقد كان هذا لا يضر
ولا يعزله عن النبوة ، وكذلك
الامامة لان الامام خليفة النبي ص
لا محالة ، وكذلك علي رض ما كان
مطاعا من جميع المسلمين ومع
ذالك ما صار معزولا ولا تصح
ما قلنا [له]

اطاعت لوگوں پر فرض ہے تو اگر لوگوں نے
امام کی اطاعت نہیں کی تو یہ نافرمانی ان
لوگوں کی جانب سے ہوئی اور عامۃ الناس
کی نافرمانی امامت کیلئے مضر نہیں ہے ۔
لہٰذا اگر قہر حاصل نہیں ہوا تو اس کا سبب
لوگوں کی سرکشی ہے اور ان کی سرکشی
امام کو امامت سے معزول نہیں کر سکتی
کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ نبی علیہ السلام
ابتدائے اسلام میں مطاع نہیں تھے اور عادتاً
آپ کیلئے دشمنوں پر قہر کرنا ممکن نہیں تھا
اور کفار نے آپ کی امداد اور آپ کے دین کی
نصرت سے سرکشی کی اور قطعی طور پر یہ امر مضر
نہیں ہوا اور اسکی وجہ سے آپ نبوت سے
معزول نہیں ہوئے ، بس یہی حکم امامت کا
بھی ہے کیونکہ امام تو بالیقین نبی کا نائب
ہوتا ہے اسی طرح علی رضی اللہ عنہ جملہ
مسلمانوں کے مطاع نہیں تھے ۔ باوجود
اسکے وہ برحق امام و خلیفہ رہے اور معزول
نہیں ہوئے لہٰذا میں نے جو بات کہی وہی صحیح ہے ۔

له تمہید ابوالشکور ص ١٨٥ ۔

ان تصریحات کے ہوتے ہوئے کیا اس نقطۂ نظر کو صحیح کہا جاسکتا ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں امت مسلمہ غیر مسلم حکومت کے زیر نگیں ہے تنظیم مسلمین کے اہم ترین امر کو یہ کہہ کر غیر شرعی قرار دیدیا جائے کہ ان کے رئیس وامیر کو قوت و شوکت حاصل نہیں ہے اس لئے بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مفتی صاحب موصوف نے "شامی اور شرح عقائد نسفی" کی جن دو عبارتوں کو پیش کیا ہے وہ بے محل ہیں اور ان بے محل عبارتوں کی بنیاد پر امیر شریعت ہند کے انتخاب کو شرعی نقطۂ نظر سے غیر صحیح بتانا صحیح نہیں ہے۔

اشکال ۲: ۔ مولانا مفتی نظام الدین مفتی دارالعلوم دیوبند صاحب کا حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے فتوے سے امارت کی صحت پر استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ (الف) یہ فتویٰ مدارس کے چندہ کی رقم کے سلسلے میں ہے اس میں امارت کا کوئی ذکر نہیں (ب) یہ حضرت سہارنپوریؒ کا ایک خیال ہے جس کی تائید میں نہ تو کوئی دلیل ہے اور نہ نص (ج) حضرت تھانویؒ کو مولانا سہارنپوریؒ کی اس رائے سے اتفاق بھی نہیں ہے (د) دلیل عقلی سے بھی یہ استدلال باطل ہے۔ (ہ) انہیں وجوہ سے حضرت تھانویؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت شیخ الہند علیہم الرحمۃ وامثالہم نے اس طرح کی امارت کا خیال کبھی نہیں پکایا اور جب کبھی ان حضرات کے روبرو امارت وامامت کا مسئلہ خود ان کیلئے یا دوسروں کیلئے آیا تو صاف رد فرمادیا۔

جواب: ۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کا فتویٰ اور اس کے پس منظر کو مختصر لفظوں میں بیان کردیا جائے تاکہ قارئین کو بات سمجھنے میں آسانی ہو۔ بعد ازاں مفتی صاحب محترم کے دعوئ استدلال کی بے بنیادی کے وجوہ کا جائزہ لیا جائے۔

حضرت اقدس مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے مدارس کے چندہ کے سلسلہ میں بغرض تحقیق حضرت محدث سہارنپوریؒ کی خدمت میں درج ذیل اشکال تحریر فرما کر بھیجا تھا۔

"مدرسہ میں جو روپیہ آتا ہے اگر یہ وقف ہے تو بقاء عین کہاں ہے اور یہ ملک معطی کا ہے تو اس کے مر جانے کے بعد واپسی ورثہ کی طرف واجب ہے"۔

حضرت محدث سہارنپوریؒ نے اس سوال کے جواب میں تحریر فرمایا۔

"عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال معطین اور آخذین کی طرف سے وکلاء ہیں لہٰذا اس میں نہ زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ معطین واپس لے سکتے ہیں"۔

بعینہٖ یہی جواب حضرت قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نے بھی ایک اشکال کے موقع پر دیا تھا[1]

حضرت حکیم الامت نے اس جواب پر ایک شبہ پیش فرمایا، اس شبہ کے رفع کیلئے حضرت سہارنپوری نے حسب ذیل تحقیق سپرد قلم فرمائی۔

"بندہ کے خیال میں سلطان میں دو وصف ہیں ایکؔ حکومت، جس کا ثمرہ تنفیذ حدود و قصاص، دوسرا انتظام حقوق عامہ، امر اول میں کوئی اس کا قائم مقام نہیں ہو سکتا ہے۔ امر ثانی میں اہل حل وعقد بوقت ضرورت قائم مقام ہو سکتے ہیں وجہ یہ ہے کہ اہل حل وعقد کی رائے ومشورہ کے ساتھ نصب سلطان وابستہ ہے جو باب انتظام سے ہے

---

[1] ملاحظہ ہو تذکرۃ الرشید ج ۱ ص ۱۶۴، ۱۶۵۔

لہٰذا مالی انتظام مدارس جو برضائے ملاک وطلبہ ابقاء دین کیلئے کیا گیا ہے بالاولیٰ معتبر ہوگا اور ذرا غور فرمائیں انتظام جمعہ کیلئے عامہ کا نصب امام معتبر ہونا ہی جزئیات میں اس کی نظیر شاید ہو سکے یہ[1]

حضرت اقدس سہارنپوری کی اسی تحقیق سے استدلال کرتے ہوئے حضرت استاذ محترم مولانا مفتی نظام الدین مفتی دارالعلوم دیوبند نے زیر بحث امارت کی تائید میں تحریر فرمایا ہے کہ "امیر المؤمنین کی امارت میں دو جہت ہوتی ہیں ایک جہت تو وہ ہے جس میں سد ثغور، اجراء حدود سے بحث ہوتی ہے اور دوسری جہت (میں) اندرون ملک معاملات جیسے عائلی قوانین وغیرہ انتظامی کی بحث، اس دوسری جہت کے اعتبار سے بھی اگر کسی کا انتخاب عہدۂ امارت پر ہو جائے تو اس کی اطاعت بھی مثل اطاعت امیر واجب ہوگی جیساکہ امداد الفتاویٰ ص ۲۲۱ ج ۴ قدیم میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ محدث سہارنپوری اور حضرت تھانوی کی مکاتبت ومراسلت سے واضح ہے"۔

یہ ہے حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب کا وہ استدلال جس پر مفتی صاحب حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس کی بے بنیادی کو ثابت کرنے کی غرض سے مذکورہ بالا وجوہ ذکر فرمائے ہیں۔

(الف) صدر مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت سہارنپوریؒ کا یہ ارشاد حضرت تھانویؒ کے ایک اشکال کے حل میں ہوا جس کا تعلق مدارس کے چندہ کی رقم سے تھا وہاں امارت وامامت کا کوئی ذکر نہیں! سوال یہ ہے کہ کیا کلام کا حکم موقعِ کلام کے ساتھ مختص ومحدود ہوتا ہے؟ "یعتبر عموم اللفظ لا بخصوص

---

[1] دونوں اکابر کی یہ مکاتبت فتاویٰ خلیلیہ کے ص ۳۱۸ تا ۳۲۵ میں ملاحظہ کی جائے۔

السبب" اور " والکلام وان وردت علی سبب خاص فعمومها معتبرة بقرینة الجمع " کے قاعدہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ موقع و مورد اور سبب کے ساتھ کلام کا حکم مخصوص نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں قیاس و استنباط کا دروازہ ہی بند ہوجائے گا جسے ہمارے محترم مفتی صاحب بھی غالباً پسند نہیں فرمائیں گے، اس لئے حضرت محدث سہارنپوریؒ کے اس ارشاد کا تعلق اگرچہ مدارس کی رقم کے ساتھ ہے پھر بھی مسئلہ امارت پر اس سے استدلال کرنے میں اصولی اعتبار سے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اس استدلال کو بے بنیاد کہا جائے۔

(ب وج) مفتی صاحب موصوف نے دو وجہوں سے حضرت محدث سہارنپوریؒ کی تحقیق کو رد کرنے کی کوشش کی ہے اوّل یہ کہ یہ حضرت سہارنپوری کا ایک خیال ہے جس کی پشت پر دلیل ونص کی قوت نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت تھانویؒ نے اس خیال سے اتفاق نہیں فرمایا ہے لہٰذا یہ خیال قابلِ استدلال نہیں ہے۔

مفتی صاحب کی تحریر کردہ پہلی وجہ کے سلسلے میں عرض ہے کہ "کسی شئی کا عدم ثبوت اس کے وجود کے عدم کو مستلزم نہیں ہوتا" اس لئے اگر ان کے خیال میں حضرت محدث سہارنپوری کا یہ ارشاد ثابت بالدلیل نہیں ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعتاً یہ ارشاد بلا دلیل ہے۔ بلکہ حسب تصریح حضرت تھانوی یہ قواعد شرعیہ سے ثابت ہے۔ علاوہ ازیں مفتی صاحب اگر حضرت محدث سہارنپوری کے ارشاد میں ادنیٰ تامل فرمالیتے تو انھیں اسی میں نہ صرف دلیل بلکہ مسئلہ کی نظیر بھی مل جاتی، حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ نے اپنی تحریر "امر ثانی میں اہل حل وعقد بوقتِ ضرورت قائمقام ہوسکتے ہیں" کے بعد " وجہ یہ ہے کہ الخ " سے مسئلہ کی دلیل کی جانب اشارہ فرمایا ہے اور " ذرا غور

فرمائیں انتظام جمعہ کیلئے الخ" سے اس کی نظیر کی طرف اشارہ فرمایا ہے، چونکہ یہ جواب حضرت حکیم الامت جیسی عبقری شخصیت کو لکھا گیا ہے اسلئے "العاقل تکفیہ الاشارۃ" کے پیشِ نظر اجمال سے کام لیا ہے۔

رہا صدر مفتی صاحب کا یہ فرمان کہ حضرت تھانویؒ کو اس سے اتفاق بھی نہیں ہے! پہلی وجہ سے بھی زیادہ بے بنیاد، صدفی صد خلافِ واقعہ اور حضرت تھانویؒ کی طرف غلط انتساب ہے، حضرت حکیم الامتؒ تو اس تحقیق سے نہ صرف اتفاق رکھتے ہیں بلکہ اسے قواعدِ شرعیہ سے ثابت شدہ بتاتے ہیں، حضرت تھانویؒ کی خدمت میں کسی صاحب نے لکھا تھا کہ (بندہ) پہلے وعظ کہا کرتا تھا لیکن جب سے حدیث میں دیکھا وعظ گوئی تین شخصوں کا کام ہے امیر، یا مامور، یا مختال اوکما قال، تو خیال ہوا کہ امیر و مامور ہوں نہیں تیسری بلا سے نجات مانگتا ہوں جب سے باقتضائے طبع وعظ بیان کرنا چھوڑ دیا اس میں قصد السبیل ارشاد فرمائیں؟

حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ نے ان کے جواب میں تحریر فرمایا "آپ مامور ہیں کیونکہ امیر کے مقابلہ میں جو مامور آیا ہے مراد اس سے مامور من الامیر ہے یعنی من نصبہ الامیر لوعظ الناس اور قواعد شرعیہ سے ثابت ہے کہ جہاں امیر نہ ہو عامۃ الناس جن میں اہل حل و عقد بھی ہوں قائمقام امیر کے ہوتے ہیں پس اگر عامۃ الناس کسی سے درخواست یا رغبت وعظ کریں اور اس شخص کے وعظ پر اہل فہم انکار نہ کریں پس وہ شخص مامور ہے آپ وعظ بدستور جاری رکھئے"[1]

---

[1] بوادر النوادر ص ۷۵۔

حضرت تھانوی رح کی اس تحریر سے صدر مفتی صاحب کا یہ اعتراض بھی کالعدم ہوجاتا ہے کہ حضرت سہارنپوری کا یہ ارشاد مدارس کے چندہ سے متعلق تھا وہاں امارت کا کوئی ذکر نہیں لہٰذا مفتی دارالعلوم کا اس ارشاد سے استدلال موجب حیرت ہے اور غیر درست کیوں کہ مفتی دارالعلوم نے اس ارشاد سے جو استدلال کیا ہے بعینہ وہی استدلال حضرت تھانوی رح بھی فرمار ہے ہیں اور بظاہر حال محترم مفتی صاحب حضرت اقدس تھانوی رح کے استدلال کو رد کرنے کی جرأت نہیں کریں گے اس لئے مفتی دارالعلوم مولانا نظام الدین صاحب کا استدلال بھی رد نہیں ہوگا لہٰذا اب ہر شخص کو اختیار ہے چاہے وہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے اس ارشاد کو تسلیم کرے یا صدر مفتی صاحب کے بے دلیل دعویٰ کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائے۔ محترم صدر مفتی صاحب نے مولانا مفتی نظام الدین صاحب کے استدلال کو بے بنیاد ثابت کرنے کی غرض سے جو تین بنیادیں قائم کی تھیں وہی بے بنیاد ثابت ہوئیں اس لئے یہ استدلال فی الواقع بالکل درست اور مستحکم ہے لہٰذا اس مستحکم دلیل پر امارت کا جو قصر قائم ہوگا انشاءاللہ " اصلہا ثابت " کا مصداق بنے گا۔

(د) مفتی صاحب نے اس استدلال کو غلط بنانے کیلئے جس دلیل عقلی کا سہارا لیا ہے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے استدلال کے بعد ہبار منثوراً سے زیادہ اس کی حیثیت باقی نہیں رہتی پھر مفتی صاحب بھی اس سے انکار نہیں فرمائیں گے کہ اس طرح کے دلائل مسکت تو ہوسکتے ہیں لیکن یقین کے نور اور اطمینان کی ٹھنڈک سے یکسر خالی ہوتے ہیں۔

(ہ) اپنے ان دلائل کو (جن کی حقیقت ظاہر ہوچکی ہے) ذکر کرنے کے بعد مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ اسی کے باعث حضرت تھانوی، مدنی، وشیخ الہند

علیہم الرحمہ نے اس طرح کا خیال کبھی نہیں پکایا الخ۔

خدا جانے صدر مفتی صاحب کے معلومات کے ذرائع کیا ہیں جن کی بنیاد پر اس قدر وثوق اور جزم کے ساتھ یہ دعوی فرمارہے ہیں، حضرت اقدس تھانوی رح کے بارے میں احقر کو معلوم نہیں کہ اپنی امارت کے سلسلے میں ان کی کیا رائے تھی البتہ نصب امیر کو وہ مسلمانان ہند کا حق سمجھتے ہیں، اور بحالت موجودہ "امارت ارادیہ پر قدرت" کے قائل ہیں ملاحظہ ہو حضرت کا فتوی رسالہ کے صفحہ ۳۹ پر اس فتوے کی موجودگی میں حضرت تھانوی رح کے متعلق مفتی صاحب کا یہ ارشاد کہ ان کے روبرو امارت کا مسئلہ آیا تو صاف رد فرمادیا محل نظر ہے رہا معاملہ حضرت شیخ الہند اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہما کا تو امارت کے سلسلے میں ان دونوں بزرگوں کا نظریہ اور اس کے قیام کیلئے ان کی کوششوں کا تفصیلی تذکرہ رسالہ ہٰذا کے صفحہ ۷۶، ۷۵ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں مولانا ابوالکلام آزاد نہایت واضح الفاظ میں اطلاع دیتے ہیں کہ ان کی درخواست پر حضرت شیخ الہند رح خود امیر بننے پر راضی ہوگئے تھے کیا اس مستند اور قوی ثبوت کے بعد اس دعوی کے لئے کوئی گنجائش باقی رہتی ہے کہ "جب کبھی ان حضرات کے روبرو امارت وامامت کا مسئلہ خود ان کے لئے یا دوسروں کیلئے آیا تو صاف رد فرمادیا" خود محترم مفتی صاحب ہی فیصلہ فرمائیں؟

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

آخر میں مفتی صاحب نے امیر الہند کی شرعی حیثیت بتانے کی غرض سے علامہ ظفر احمد تھانوی رح کی مشہور تصنیف اعلاء السنن کی ایک طویل عبارت نقل کی ہے جس کا ماحصل گزشتہ سطور میں بیان کردیا گیا ہے

نہ جانے مفتی صاحب نے کن اسباب واغراض کے تحت علامہ کی اس بے دلیل عبارت کو بغیر کسی چون وچرا کے نہ صرف خود تسلیم کرلیا بلکہ دوسروں کو منوانے کے بھی درپے ہیں جب کہ حضرت محدث سہارنپوری (جن کا علمی تبحر، ورع، تقویٰ اور تفقہ نہ صرف اپنے حلقہ میں بلکہ دوسروں کے نزدیک بھی مسلم ہے) کی مدلل عبارت کو بلا دلیل خیال کہہ کر اس سے استدلال کرنے کو موجب حیرت قرار دیتے ہیں۔ مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے حوالہ سے گذشتہ اوراق میں یہ بات گذر چکی ہے کہ "الامیر کالسلطان" یعنی غیر مسلم ممالک کا امیر مثل سلطان کے ہوتا ہے لہٰذا اسے حکم کا درجہ دینا صحیح نہیں ہے پھر اس امیر کی حیثیت اگر حکم کی ہے تو حضرات فقہاء کی یہ قید کہ "جن بلاد پر کفار کا غلبہ ہے مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہاں اپنا ایک امیر منتخب کرلیں" بے فائدہ ہو جاتی ہے کیوں کہ جس طرح بلاد کفار میں حکم بنانا درست ہے اسی طرح دارالاسلام میں بھی حکم بنانا جائز اور صحیح ہے، اور یہ امیر جب مثل سلطان کے ہے تو جس طرح سلطان کی اطاعت واجب ہے اسی طرح اس امیر کی اطاعت بھی لازم ہوگی۔ اور آیت کریمہ "لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا" وحدیث پاک "اذا امرتکم بامر فاتوا منہ ما استطعتم" (متفق علیہ) کے بموجب اس امیر کے انتخاب سے نصب امیر کا فریضہ ساقط ہو جائے گا چنانچہ راس المحدثین حضرت مولانا انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ اپنے خطبۂ صدارت

یں رقم طراز ہیں۔

"مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ خود اپنے اتفاق اور کثرت رائے سے امیر منتخب کریں ایسے امراء صوبہ دار ہونے چاہئیں اور پھر ان امراء کے اتفاق یا کثرت رائے سے تمام ہندوستان کیلئے ایک امیر اعظم ہو اگرچہ حکومت برطانیہ کے قیام و تسلط کی وجہ سے ان صوبہ دار امراء اور امیر اعظم کی کوئی سیاسی حیثیت نہ ہوگی مگر مذہبی ضروریات ان کے فیصلوں اور ان کے احکام سے صحیح طور پر واقع اور نافذ ہو سکیں گے اور مسلمانوں کا ایک بڑا مذہبی فرض (نصب امیر) ادا ہو جائے گا۔"[1]

رہا معاملہ ادنیٰ سے اعلیٰ حال کے حصول کی سعی و تدبیر کا تو اس کے استحسان سے کون انکار کر سکتا ہے کیوں کہ اس جد وجہد کا مقصود اصلی تو یہی ہے۔

---

[1] خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء دسمبر ۱۹۲۷ء

مفسرِ دہلوی کی قلمی کاوشیں

مولانا علمائے دہلی میں اردو تراجم قرآن کے تقابلی مطالعہ کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور اس موضوع پر ان کی بعض قابل قدر تصانیف بھی ہیں اسی لئے ایک مخصوص حلقے میں مفسر قرآن کی حیثیت سے یاد کئے جاتے ہیں، امیر الہند کے انتخاب کے بعد ہی سے مولانا موصوف کا اشہبِ قلم اختلاف کی علمی واخلاقی قدروں کا لحاظ کئے بغیر رواں دواں ہے، اس موضوع پر ابتک مفسر قرآن صاحب کی قلمی کاوش کے تین چار نمونے منظر عام پر آچکے ہیں علاوہ ازیں دہلی کے ایک اخبار نے ان کا ایک انٹرویو بھی شائع کیا ہے۔ ان تمام مقالات میں علمی واستدلالی انداز اختیار کرنے کے بجائے موصوف نے صحافتی وسیاسی رویہ کو اپنایا ہے اور دلائل وبراہین کے مقابلے میں طعن وتشنیع کو ترجیح دی ہے۔ ہر شخص کا اپنا ایک انداز فکر اور زاویۂ نظر ہوتا ہے جس سے دست برداری بڑے عزم وحوصلہ کو چاہتی ہے اس لئے مفسر قرآن صاحب اگر آیت پاک "لایجرمنکم شنأن قوم علیٰ ان لاتعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ" کی رعایت اس نقد وتبصرہ میں نہ کرسکے تو اس کی وجہ وہی ان کا مخصوص انداز فکر اور ذہنی چوکھٹہ ہے جس کے حصار میں انہوں نے اپنے آپ کو محصور کررکھا ہے اس لئے آں محترم سے ان کے اس رویہ کی شکایت کو مفید نہ سمجھتے ہوئے ان کے بعض فرمودات کا علمی تجزیہ اہل نظر کی توجہ کے لئے پیش کررہے ہیں۔

مولانا لکھتے ہیں "قادیانی فرقہ نے منصب نبوت کو مذاق بنانے کی ملعون کوشش کی ہے اور اب بعض سیاسی حوصلہ نکالنے والے منصب امارت کو مذاق اور استہزاء کا عنوان بنانے کی منافقانہ سازش کررہے ہیں"

یہ ہے مولانا کا اسلوب نگارش ۔ مولانا ہی بتائیں کیا مسلمانوں کو رشتہ وحدت میں حسب منشاء قرآن و حدیث منسلک کرنے کے لئے امارت کی تنظیم یہ منافقانہ سازش ہے؟ کیا اسی طرح کی امارت کا فتویٰ سراج الہند حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی نے نہیں دیا ہے۔ کیا حاکم بدھن وہ بھی اسی سازش میں ملوث تھے؟ حضرت سید احمد شہید بریلوی، سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ اور اُن کے ہاتھ پر بیعت امارت کرنے والوں کے بارے میں مفسر قرآن صاحب کا کیا ارشاد ہے؟ حضرت شیخ الہند، مولانا ابوالکلام آزاد (جنہوں نے اپنی عمر کا ایک خاص حصہ امارت کے قیام کی تدبیر وسعی میں صرف فرمایا) بھی اسی زمرے میں شامل ہیں، ہم اس موقع پر مفتی اعظم ہند حضرت مولانا کفایت اللہ دہلوی قدس سرہ کا نام ذکر نہیں کر رہے ہیں (اگرچہ تنظیم امارت کے سلسلہ میں ان کے فتادے اور کوششیں اہل علم سے مخفی نہیں ہیں) اس لئے کہ مفسر قرآن صاحب کے نزدیک تو وہ "انتہائی گستاخ، بدمذاق اور بے علم ہیں"[1] (اکابر کی شان میں اس طرح کے جملے استعمال کرنے سے اللہ ہماری حفاظت فرمائے)

مفسر قرآن صاحب کی نظر میں جب مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی جیسا عظیم شخصیت کا مالک گستاخ، اور بے علم ہوسکتا ہے تو پھر امیر الہند محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور نائب امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہما کے متعلق وہ جو کچھ بھی فرما دیں تعجب خیز نہیں ہے۔

اس کے بعد محترم لکھتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اجتماعی زندگی گزارنے کی تاکید

---

[1] مفسر صاحب کی اس تحریر کے لئے دیکھیے "عقیدہ اور رواداری ص ۳۰ - ۳۱"

فرماتے ہوئے یہ فرمایا "لا اسلام الا بجماعۃ و لاجماعۃ الا بامارۃ ولاامارۃ الا بطاعۃ ۔ (جامع ابن عبدالبر)

معلوم ہوتا ہے ہمارے مفسر علام نے کسی اردو کے مضمون یا کتاب میں دیکھ کر اسے نقل کر دیا ہے اور سامعین پر اپنا علمی رعب قائم کرنے کی غرض سے جامع بیان العلم کا حوالہ دے دیا ہے کاش کہ مولانا ابن عبدالبر کی کتاب کو اٹھا کر خود دیکھ لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ علامہ ابن عبدالبر نے اس عبارت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی حیثیت سے نقل نہیں کیا ہے بلکہ یہ حضرت فاروقِ اعظمؓ کا قول ہے پھر صفحہ کا حوالہ بھی انتہائی مضحکہ خیز ہے جس نے بھی اس کتاب کو دیکھا ہوگا موصوف کی اس علمی بے احتیاطی پر حیرت کرے گا۔

مفسر قرآن صاحب بعد ازاں تحریر فرماتے ہیں۔

"اسی کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر و امام کی بنیادی شرط بیان کرتے ہوئے فرمایا "الامام الضعیف ملعون" (حدیث صحیح) کمزور امام و امیر ملعون ہے ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص کمزور ہو کر ملت اسلامیہ کا امیر و امام بن جائے وہ ملعون و مردود ہے" الخ

یہ حدیث نقل کر کے موصوف نے حدیث صحیح کا حکم لگایا ہے، حالانکہ محدثین کے نزدیک یہ حدیث انتہائی درجے کی ضعیف ہے ۔ امام الہیثمی نے "الامام الضعیف عن الحق" کا عنوان قائم کر کے اس کے ذیل میں لکھا ہے۔

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الامام

الضعیف معلون" رواه الطبرانی وسقط عن اسنادہ رجل بین عبد الکریم بن الحارث و بین ابن عمر و فیہ جماعۃ لم اعرفہم۔[1]

ابن عمر نے کہا حضورؐ کا ارشاد ہے امام ضعیف معلون ہے اس روایت کی تخریج امام طبرانی نے کی ہے اس کی سند سے عبد الکریم بن الحارث اور ابن عمر کے بیچ کا راوی غائب ہے نیز اس کے راویوں میں ایک جماعت ایسی ہے جنہیں میں جانتا نہیں۔

علامہ ہیثمی کی اس بحث سے معلوم ہوا کہ یہ روایت منقطع بھی ہے اور اس کے راویوں میں ایک نہیں بلکہ ایک جماعت مجہول لوگوں کی ہے ایسی روایت کو "حدیث صحیح" کہنا یہ مفسر علام کا ایسا نرالا دعویٰ ہے جس کی تائید اصول حدیث کی کتابوں سے پیش نہیں کی جاسکتی۔ اس حدیث کی حیثیت پر مزید معلومات حاصل کرنے کیلئے مفسر علام اگر کتب متعلقات حدیث کی جانب مراجعت میں زحمت محسوس فرمائیں تو کم از کم مولانا عبد الصمد رحمانی کی کتاب "ہندوستان اور مسئلہ امارت" کے صفحات ۱۰۷ تا ۱۱۲ کا مطالعہ فرمالیں جو اردو زبان میں ہونے کی بنا پر سہل الفہم بھی ہے۔

اس طرح کی حد درجہ ضعیف و کمزور حدیث کو مستدل بنا کر کسی کو مردود، معلون قرار دینے سے پہلے مفسر علام کو قطب ارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہ کا یہ فتویٰ ملاحظہ کرلینا چاہیئے تھا۔

حدیث صحیح میں ہے کہ جب کوئی کسی پر لعنت کرتا ہے اگر وہ شخص قابل لعن کا ہے تو لعن اس پر پڑتی ہے ورنہ لعنت کرنے والے پر رجوع کرتی ہے پس جبتک کسی کا کفر پر مرنا محقق نہ ہو جائے اس پر لعنت کرنا نہیں چاہیئے۔[2]

---

[1] مجمع الزوائد ج ۵ ص ۲۰۹ [2] فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۰

محترم مفسر صاحب سے عرض ہے کہ کیا وہ اس حدیث کا مصداق بننا گوارہ فرمائیں گے ؟ اگر نہیں تو انہیں غور و فکر اور تحقیق کے بعد قلم اٹھانا چاہیئے یہ طریقہ انکے لئے دنیا و آخرت دونوں کے لئے بہتر ہو گا۔

موصوف نے ذات برادری کے مسئلے کو بھی ہوا دینے کی کوشش کی ہے ظاہر ہے کہ آنمحترم کی یہ ذہنیت اسلامی نہیں ہے بلکہ برہمنی ہے جس کا غلط ہونا اظہر من الشمس ہے اس لئے اس پر کچھ لکھنا بے سود ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے امام کے شرائط پر جو بحث کی ہے اس سلسلے میں پیش نظر رسالہ میں تفصیل سے گفتگو آچکی ہے لہذا اس کا یہاں اعادہ مناسب نہیں ہے اس بحث کو دیکھ لیا جائے۔

ایک اور صاحب کی خامہ فرسائی

کوئی مولانا معاذ الاسلام نامی بزرگ ہیں، جن سے بندہ واقف نہیں ہے، انہوں نے بھی اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ "امیر الہند کا انتخاب اس ملک میں ناممکن العمل ہے" دلیل یہ ہے کہ جبتک ملک کے تمام مسلمانوں کا کسی کی امارت پر اتفاق و اجتماع نہ ہو جائے وہ امیر نہیں ہو سکتا۔ موصوف کے اس مضمون کو امارت شرعیہ بہار کے ترجمان "نقیب" میں بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، امارت شرعیہ بہار نے اس مضمون کو خدا جانے یہ اہمیت کن اغراض و مقاصد کے تحت دی ہے اسے اسی ادارے کے ارباب حل و عقد ہی جانتے ہوں گے لیکن اس مضمون میں امیر الہند کے انتخاب کو ناممکن العمل ہونے پر جن دلائل کو پیش کیا گیا ہے ان کی روشنی میں بہار کے امیر شریعت کی امارت بھی کالعدم ہو جاتی ہے کیونکہ تمام مسلمانان بہار کا اتفاق ان کی امارت پر نہ کل تھا اور نہ آج ہے، خدا جانے ان حضرات کے نزدیک اس کی صحت کے کیا دلائل ہیں۔ رہا موصوف کا یہ استدلال تو اسی رسالہ کے گذشتہ اوراق میں ہم حضرت شاہ ولی اللہ

صاحب کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں کہ انعقاد امارت کے لئے جمیع حل وعقد کا اجتماع ضروری نہیں ہے چہ جائیکہ تمام مسلمانوں کا اجتماع شرط قرار دیا جائے اس موضوع پر کتاب میں مکمل بحث موجود ہے دیکھ لی جائے ۔

آخر میں موصوف نے مفتیان دارالعلوم سے موجودہ امارت کی شرعی حیثیت کو واضح کرنے کا مطالبہ کیا ہے ان کے مطالبے کے جواب میں یہ کتاب حاضر ہے جو حضرات مفتیان دارالعلوم کے ایک خادم ہونے کی حیثیت سے پیش کی جارہی ہے۔ رہا ان کے طعن وتشنیع کا جواب تو اس کے لئے موصوف کو دارالجزار کے انتظار کی زحمت گوارہ کرنی پڑیگی وہیں اس کا جواب ملے گا یہ حقیر اس کے جواب سے عاجز ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی النبی الکریم وعلی خلفائہ الراشدین ۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں